رہنمائے حیات
مولانا وحید الدّین خاں

رہنمائے حیات

مولانا وحید الدین خاں

فہرست مضامین

باب اول

فہرست مضامین

باب اول

باب اول

قناعت واحد حل

خدا نے موجودہ دنیا کے نظام کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کسی کو بھی تمام چیزیں نہیں مل سکتیں، خواہ وہ بڑا آدمی ہو یا چھوٹا آدمی۔ **ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم** (فصلت ۳۱) کی دنیا کسی کو صرف اگلی زندگی میں جنت میں مل سکتی ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی ہر مطلوب چیز کو پالے، اس کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی مایوسی (frustration) کا شکار نظر آتا ہے، ہر آدمی ذہنی تناؤ میں مبتلا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے۔ آدمی کو سو میں سے ننانوے چیز مل جائے اور صرف ایک چیز نہ ملے تب بھی وہ پریشان رہتا ہے۔ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے سو چیزوں سے کم پر راضی نہیں ہوتا اور فطرت کے قانون کے مطابق سو چیز اس کو کبھی نہیں ملتی۔ خواہش اور واقعہ کے درمیان اسی تضاد نے تمام لوگوں کو ذہنی سکون سے محروم کر رکھا ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ **الھکم التکاثر** کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں۔ یہ نفسیات آپ کے لیے مزید پریشانی کا سبب بن جائے گی۔ اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے اور وہ قناعت ہے۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ کو ملے اس کو آپ فطرت کی تقسیم کا نتیجہ سمجھ کر اس پر راضی ہو جائیں۔ حرص کا مطلب فطرت کی تقسیم پر راضی نہ ہونا ہے۔ اس کے مقابلہ میں قناعت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی فطرت کی تقسیم پر راضی ہو جائے۔ ذہنی سکون اور ذہنی بے سکونی کا سبب تمام تر یہی ہے۔ آدمی اگر جان لے کہ جو کچھ ہوا وہ فطرت کے قانون کے تحت تھا، وہ انسانی ظلم کی بنا پر نہ تھا، تو وہ غیر ضروری پریشانیوں سے بچ جائے۔

یہی بات ایک حدیث رسول میں اس طرح کہی گئی ہے: **قد افلح من أسلم ورزق کفافاً و قنعه الله بما آتاه** (مسند احمد، جلد ۲، صفحہ ۱۶۸) یعنی وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اسلام کو اپنایا اور اُس کو بقدرِ کفاف رزق ملا۔ اور اللہ نے اس کو اُس پر قانع بنا دیا جو اُس نے اُس کو دیا۔

سوچنے کا طریقہ

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کے شمارہ اپریل ۲۰۰۴ میں ایک رپورٹ چھپی ہے جس کا عنوان یہ ہے: ''ادارہ الفرقان کی زندگی کا ایک یادگار دن''۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۲۷ فروری ۲۰۰۴ کو ندوہ (لکھنؤ) کے شبلی ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں علماء اور طلباء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ جلسہ مولانا محمد منظور نعمانی کے درس قرآن کی اشاعت کے سلسلہ میں تشکر اور تعارف کے موضوع پر ہوا تھا۔

اس جلسہ کے صدر مولانا سید رابع حسنی ندوی تھے۔ اس روداد کے مرتب مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ہیں۔ اس جلسہ کے موقع پر شبلی ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ اس میں مختلف علماء نے تقریریں کیں۔ ان مقررین میں سے ایک ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی تھے۔ وہ دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک ان کا ذاتی مشاہدہ تھا۔ ان کی تقریر کے اس حصہ کو الفرقان سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے، مولانا محمد منظور نعمانی کے طرز کلام کی خصوصیات اور ان کی تقریروں کا جو غیر معمولی اثر سننے والوں پر پڑا کرتا تھا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۹۵۳ میں بستی کے ایک اجلاس میں جس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم خواص بھی مدعو کیے گئے تھے، توحید کے موضوع پر ان کی ایک تقریر کا ذکر، بطور مثال کیا اور کہا کہ اس تقریر کے سننے والوں میں انٹر کالج میں ہندی کے ایک لکچرر جناب گنیش پرشاد سریواستوا صاحب بھی تھے۔ رات میں تقریر سن کر وہ چلے گئے اور رات بھر روتے رہے۔ دوسرے دن صبح کو ایک مخصوص نشست رکھی گئی تھی اس میں بھی وہ آئے۔ مولانا نعمانی کی ان پر نظر پڑی۔ مولانا نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں میں تعارف ہوا اور پھر ہم لوگوں نے دیکھا کہ گنیش پرشاد سریواستوا اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے، وہ زار و قطار رونے لگے۔ ہم نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ مولانا! جس طرح کی تقریر آپ نے توحید کے موضوع پر کی ہے۔ اگر اس کا سلسلہ ہندستان

میں شروع ہو جائے تو کم از کم ہم جیسے لوگ تو اسلام سے بہت قریب آ جائیں گے۔ بعد میں بستی میں یہ بھی مشہور ہوا کہ عمر کے آخری حصے میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، واللہ اعلم۔ بہر حال عجیب وغریب اثر رکھا تھا اللہ نے مولانا محمد منظور نعمانی کی تقریر اور تحریر میں۔''
(صفحہ ۱۵)

مذکورہ واقعہ پچاس سال سے بھی زیادہ پہلے ۱۹۵۳ میں پیش آیا۔ یہ واقعہ ہندستان میں عظیم دعوتی امکان کو بتا رہا تھا۔ اس اعتبار سے اس میں علماء کے لیے یہ اہم رہنمائی موجود تھی کہ اس ملک میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اُس وقت ملک میں بڑے بڑے علماء موجود تھے مگر اس پہلو سے کچھ بھی نہ کیا جاسکا۔ اس کا سبب سوچنے کا ایک غلط طریقہ تھا۔ جیسا کہ اقتباس سے واضح ہے، لوگوں نے اس واقعہ کو صرف مقرر کی شخصی تعریف کے معنی میں لیا۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہو گئے کہ ہمارے فلاں عالم عجیب وغریب قسم کی تقریر کرتے ہیں۔ اُن کی تقریر میں سحر انگیز اثر پایا جاتا ہے۔

اس معاملہ میں سوچنے کا دوسرا زیادہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ اُس کو دعوتی امکان کے پہلو سے لیا جاتا۔ یعنی یہ کہ اس ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو دین حق کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر اُس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے بعد ہندستان کے بڑے بڑے علماء کا ایک جلسہ کسی مرکزی شہر میں کیا جاتا۔ اس جلسہ میں یہ بتایا جاتا کہ واقعات کی روشنی میں ضروری ہو گیا ہے کہ ہندستان میں دینی کام کے لیے ہم اپنے پورے نقشہ کو بدل دیں۔ اب یہاں کام کا نیا منصوبہ بنایا جائے۔

اس جلسہ میں بتایا جاتا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرو، اس کے بعد ہی دوسروں میں دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے، ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اعلان کریں کہ ہم غلطی پر تھے۔ مسلمانوں کی موجودہ اخلاقی حالت ہی میں یہاں دعوت کے غیر معمولی امکانات موجود ہیں جن کو ہمیں استعمال کرنا چاہیے۔ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلے مکمل اسلامی نظام قائم کر کے دکھاؤ، اس کے بعد ہی دوسرے لوگ اسلام کی طرف راغب ہوں گے، ایسے لوگوں کی سوچ بھی سرتاسر غلط ہے۔ کیوں کہ واقعات بتاتے ہیں کہ ''مکمل اسلامی نظام'' کے نفاذ سے پہلے ہی خدا کے بندے اسلام کو اپنانے

کے لیے تیار ہیں۔ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس ملک کا اکثریتی طبقہ اسلام کا دشمن بن چکا ہے، وہ ہمارا حریف ہے، نہ کہ مدعو، ایسے لوگوں کو بھی کھلے طور پر ماننا چاہیے کہ یہ سوچ بالکل غلط تھی۔ اس ملک کے اکثریتی فرقے کے اندر آج بھی اسلام کے لیے نرم گوشہ موجود ہے جس کو ہم حکمت کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ہندستان میں بہت سے مسلمان ہیں جو آزادی (۱۹۴۷) کے بعد طرح طرح کے ناموں سے جزئی مقاصد کے لیے جماعتیں اور تنظیمیں بنائے ہوئے ہیں۔ ان سب کو کھلے طور پر یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہماری سوچ درست نہ تھی۔ اسلام کا سب سے بڑا کام دعوتی کام ہے۔ اور جب دعوتی کام کے روشن امکانات موجود ہوں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر اپنی ساری طاقت دعوت کے محاذ پر لگا دی جائے۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کا جان و مال محفوظ نہیں، ان کی دینی اور ملّی شناخت کو مٹایا جا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی یہ کھلا اعلان کرنا چاہیے کہ مفروضہ یا غیر مفروضہ خطرہ کے باوجود اس ملک میں اسلام پوری طرح محفوظ ہے اور ہمارے لیے یہ امکان موجود ہے کہ ہم اسلام کے پیغام کو لے کر آگے بڑھیں اور پھر یقینی طور پر یہاں وہ منظر دکھائی دے گا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **فاذا الذی بینك و بینه عداوۃ کانه ولي حمیم۔**

مگر عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ان میں سے کوئی بھی کام نہ ہو سکا۔ کسی اعلان کرنے والے نے اس قسم کا اعلان نہیں کیا۔ ۱۹۵۳ کے بعد سے اب تک سینکڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ ان جلسوں میں پُر جوش الفاظ میں یہ کہا گیا کہ اس ملک میں اسلام خطرہ میں ہے۔ مگر کسی بھی جلسہ میں مسلم رہنماؤں نے یہ زیادہ اہم بات نہیں بتائی کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں اسلام پیش قدمی کی پوزیشن میں ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے باشندے اس فارسی شعر کا مصداق ہیں:

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف　　　به امید آں که روزے به شکار خواهی آمد

یہ فرق کیوں ہوا۔ یہ سوچ میں فرق کا نتیجہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ سوچنے کے دو طریقے بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک ہے، فخر کے جذبہ کے تحت سوچنا اور دوسرا ہے، دعوت کے جذبہ کے تحت سوچنا۔ فخر کے جذبہ کے تحت سوچنے والوں کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنی محبوب شخصیت کا کمال بتا کر مطمئن ہو جائیں اور اس کو بیان کر کے اپنے آپ کو خوش کرتے رہیں۔

سوچ کا دوسرا طریقہ وہ ہے جو دعوتی مقصد پر مبنی ہو۔ ایسے لوگ اس قسم کے معاملہ کو دعوتی امکان کے روپ میں لیں گے۔ وہ اس میں اپنے لیے مستقبل کا نقشۂ کار دریافت کرلیں گے۔ اُن کی سوچ اُنہیں یہ بتائے گی کہ جب زیادہ دوررس کام کے مواقع ہوں تو چھوٹے چھوٹے کاموں میں وقت ضائع کرنا نادانی ہے۔ جب اسلام دلوں کو فتح کرنے کی پوزیشن میں ہو تو چھوٹی چھوٹی شکایتوں کو لے کر احتجاجی مہم چلانا صرف دیوانگی ہے۔ جب دین اسلام کے لیے نیا مستقبل پیدا کرنے کا موقع ہو تو شخصی کمال کو لے کر خوش ہونا اس شعر کا مصداق ہے کہ:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا   ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اتحاد کا فارمولا

نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۹ میں امریکہ کے لئے میرا دسواں سفر ہوا۔ میں اپنے سفروں میں ہمیشہ وہاں کے حالات جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ موجودہ زمانہ میں امریکہ کو مادی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ اس کاراز میں نے یہ جانا کہ امریکہ کے لوگ کٹر ذہن کے نہیں ہیں۔ وہ تجربہ سامنے آنے کے بعد فوراً اس کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں یونی کلچرل ازم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی یہ کوشش کی گئی کہ امریکہ کے تمام لوگ ایک ہی کلچر کو اختیار کر لیں۔ اس تحریک کو امریکنائزیشن کا نام دیا گیا۔ مگر متنوع کلچر کے امریکی سماج میں اس نظریہ کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اب امریکیوں نے اس کے جبری نفاذ کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یونی کلچرل ازم کے نظریہ کو چھوڑ کر ملٹی کلچرل ازم کے نظریہ کو اختیار کر لیا۔

اب امریکہ میں ہر کلچرل گروپ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ انھیں باقاعدہ تعاون دیا جاتا ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے اپنے کلچرل روٹ پر قائم رہو۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسٹیبلائزڈ سوسائٹی (Stabilized Society) اسی طرح بن سکتی ہے۔ جس سماج کے افراد اپنی ثقافتی جڑوں سے اکھڑ جائیں، وہ اکھڑے ہوئے پیڑ کی مانند ہیں۔ ایسے لوگ نہ اپنے کام کے ہوں گے اور نہ دوسروں کے کام کے۔ کلچرل نیشنلزم یا یونی کلچرل ازم ایک قسم کا نظریاتی جنون ہے۔ ایسا نظریہ تخریب کاری میں تو مددگار ہو سکتا ہے مگر وہ کسی قوم کی تعمیر کاری نہیں کر سکتا۔

اس کے پیچھے زبردست حکمت ہے۔ کسی قوم کا کلچر ہمیشہ تاریخی عمل کے دوران تدریجی طور پر بنتا ہے۔ کلچر کوئی نافذ کرنے کی چیز نہیں۔ کسی خود ساختہ کلچر کو جبری طور پر نافذ کرنا سوسائٹی کو ڈی اسٹبلائز کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ سماجی انتشار ہوتا ہے

ہندستان میں کلچر کے معاملہ میں صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ ''رام رحیم ایک ہے''۔ مگر یہ ایک خلاف واقعہ بات تھی اس لئے وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ خود مہاتما گاندھی بھی

اس کو اختیار نہ کر سکے۔ ۱۹۴۸ میں جب ان کو گولی لگی تو انھوں نے "ہے رام ہے رحیم" نہیں کہا بلکہ اس وقت ان کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ صرف یہ تھا: "ہے رام"۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ جو ہندستان میں ابھرا وہ ہندتو کا نظریہ تھا جس کو کلچرل نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ یعنی سب کو ایک مفروضہ بھارتی کلچر کا پابند بنانا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو رامائزیشن آف رحمان کہا جاسکتا ہے۔ یہ دوسرا نظریہ نا قابل عمل ہونے کے ساتھ کٹر پن یا فناٹسزم کا عنصر بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ عقل اور فطرت دونوں کے خلاف تھا اس بنا پر وہ نہ چلا اور نہ کبھی چل سکتا۔ صحیح اور فطری بات یہ ہے کہ کلچرل اختلاف کے معاملہ میں لکم دینکم ولی دین کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی وہی طریقہ جس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے:. Let us agree to disagree.

کلچر اپنی فطرت ہی میں متنوع چیز ہے۔ کلچر کے معاملہ میں صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہر ایک کو آزادی دی جائے، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی آزادی کو جارحیت کی حد تک نہ لے جائے۔ گاندھی اور ان جیسے لوگوں کا نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ تم مجھ کو سچا مانو میں تم کو سچا مانوں گا۔ اس کے مقابلہ میں ہندتو کا نظریہ گویا تنوع کو بلڈوز کر کے صرف ایک کو قائم کرنے کا نام ہے۔ مگر یہ دونوں ہی نا قابل عمل ہیں۔ اس معاملہ میں صحیح فارمولہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنی پسند کے طریقہ پر چلے، اور دوسرا طریقہ اپنانے والوں کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا جائے۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرق و اختلاف انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں۔ بالفرض اگر ہم مذہبی فرق کو ختم کر دیں تب بھی ہزاروں معاملات ایسے باقی رہیں گے جن میں لوگوں کے درمیان فرق و اختلاف موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ ہے کہ مجموعی انسانی زندگی کے لئے اتحاد کا فارمولا دریافت کیا جائے نہ کہ صرف مذہبی شعبہ کے لئے۔ اور یہ فارمولہ صرف ایک ہے۔ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کرنا اور باہم مل جل کر رہنا۔

بے بنیاد شکایت

ہندستان کے ایک مسلمان تاجر ہیں۔ پہلے وہ الرسالہ کے باقاعدہ قاری تھے۔ پھر ایک مسئلہ پر اُن کو شکایت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں اور ہندوؤں کے خلاف کبھی نہیں لکھتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں۔ آپ کو ہندوؤں کی طرف سے اس کام کے لئے پیسہ ملتا ہے کہ آپ ہندو۔ مسلم معاملات میں مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرائیں۔ اس قسم کی بات کہہ کر اُنہوں نے الرسالہ کی خریداری بند کردی۔ اُنہوں نے نہ صرف الرسالہ کا مطالعہ چھوڑ دیا بلکہ وہ اس کے مخالف بن گئے۔

کئی سال بعد ۱۶ اپریل ۲۰۰۲ء کو دہلی میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کوئی اختلافی بات کیے بغیر اُن سے کہا کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی خاص تجربہ بتائیے۔ اُنہوں نے کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے سب سے زیادہ غیر سنجیدہ لوگ ہیں۔ اُن کے الفاظ میں، مسلمان لفظ کا اگر انگلش ترجمہ کیا جائے تو وہ اِن سینسیر (insincere) ہوگا۔ اُنہوں نے مزید بتایا کہ اسی ذاتی تجربہ کی بنیاد پر اُنہوں نے اب اپنا پارٹنر ایک ہندو کو بنایا ہے۔ ہندو کی پارٹنر شپ میں ان کا کاروبار کافی ترقی کررہا ہے۔

مگر عبرت انگیز بات ہے کہ مذکورہ مسلم تاجر نے نجی ملاقات میں تو یہ بات کہی لیکن وہ اس بات کو اسٹیج پر کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نیز اُنہوں نے الرسالہ کی نسبت سے اپنی پچھلی غلطی کا اعتراف بھی نہیں کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کا یہی دہرا معیار موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کے جو صاحب فہم اور صاحب علم افراد ہیں وہ اپنی نجی گفتگو میں ہمیشہ اسی قسم کی بات کرتے ہیں مگر وہ پبلک میں اُسے کہنے کے لیے تیار نہیں۔ اس دہرا معیار کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خود اپنا معاملہ تو ہوشیاری کے ساتھ درست کیے رہتے ہیں مگر مسلم عوام کو

ذہنی گمراہی میں ڈال کر اُنہیں اُس کا انجام بھگتنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ اپنا ذاتی مسئلہ تو ہوشیاری کے ساتھ درست کر لیتے ہیں مگر وہ عوام کو بدستور بے شعوری کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اُس کی بھاری قیمت ادا کرتے رہیں اور کبھی ترقی نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کے لیے صحیح انداز غیر جانبدارانہ نصیحت کا انداز ہے۔ مگر اُن میں سے کوئی نصیحت کی بولی بولنے کے لیے تیار نہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کے حالات کو میں ۱۹۴۷ سے مسلسل دیکھتا رہا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ مسلمان اپنے مسئلہ کا حل قرآن میں نہیں ڈھونڈتے، وہ دوسروں کی باتیں سُن کر اپنی رائے بناتے ہیں۔ اسلام اُن کی زندگی کا صرف ایک رسمی حصہ ہے۔ اسلام اُن کا قومی کلچر ہے، وہ اُن کا دین نہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی اجتماعی سوچ، اُن کی ملّی پالیسی قرآن سے ماخوذ نہیں۔

اپوزیشن پارٹیوں کے بیانات، ہیومن رائٹس کمیشن کی رپورٹیں، تعلیم یافتہ طبقہ کا اظہار خیال، یہی مسلمانوں کی ذہن سازی کے ذریعے ہیں۔ اُن کا مشترک طریقہ یہ ہے کہ وہ حالات کو قانون اور منطق کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب بھی اُنہوں نے جنگ کی آگ بھڑکائی تو خُدا نے اس آگ کو بجھا دیا (المائدہ ۶۴)

اس اعتبار سے دیکھئے تو دوسروں کا طریقہ آگ بھڑکانے والوں کی مذمت کرنا ہے۔ جب کہ قرآن کے مطابق، مسلمانوں کا طریقہ آگ بجھانے کا ہونا چاہئے، نہ کہ ایسا طریقہ اختیار کرنا جو آگ کو مزید بھڑکانے کا سبب بن جائے۔ اس طرح کے معاملات میں قرآن کا طریقہ اصلاحِ خویش کے اصول پر قائم ہے اور دوسروں کا طریقہ احتساب غیر کے اصول پر۔

غلط سوچ کا مسئلہ

ماہنامہ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: آپ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدمی کے لئے جب کامیابی کا ایک موقع ختم ہو جائے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس کے بعد دوسرا موقع وہیں اس کے لئے موجود رہتا ہے، جس سے وہ اپنی ترقی کا سفر دوبارہ شروع کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ آدمی کس طرح جانے کہ یہاں اس کے لئے دوسرا موقع موجود ہے۔ (سہیل احمد، نئی دہلی)

نئے موقع کو پہچاننے کی شرط صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی بند ذہن کے تحت نہ سوچے بلکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کے لئے تیار ہو۔ وہ دوسروں کو قصور وار ٹھہرانے کے مزاج سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا لے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے مسلمان ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے لیڈر اور ہمارے اخبارات مسلمانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ہندستان میں ان کا مقابلہ ہندو اکثریت سے ہے۔ یہاں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد بھی یہی ذہن باقی رہا۔ تمام بولنے والے اور لکھنے والے لوگ مسلمانوں کو یہی منفی سبق دیتے رہے۔ کچھ لوگ اس حد تک گئے کہ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہاں کا اکثریتی فرقہ ہندستانی مسلمانوں کے حق میں اس ملک کو دوسرا اسپین بنانا چاہتا ہے۔

اس غوغا آرائی نے مسلمانوں کے ذہن کو اتنا زیادہ بگاڑا کہ وہ سمجھنے لگے کہ ہندستان میں ان کے لئے کامیابی اور ترقی کے مواقع سرے سے موجود ہی نہیں۔ میں ۱۹۴۷ سے اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہا ہوں۔ آخر کار آزادی کے تقریباً ۴۰ سال بعد مسلمانوں کا ذہن بدلنا شروع ہوا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں ان کے لئے ہر قسم کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں کے مسلمان ہر میدان میں مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام فطرت کے قوانین کے تحت چلتا ہے نہ کہ کسی متعصب فرقہ کے منصوبوں یا سازشوں کے تحت۔ کوئی فرقہ یا گروہ بالفرض چاہے بھی تو فطرت اس کے راستہ میں

رکاوٹ بن جائے گی اور وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف گھمانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس دنیا کا نظام فطرت کے اٹل قانون کے تحت چل رہا ہے نہ کہ کسی گروہ کی سازش کے تحت۔ فطرت کے اس قانون کا ایک حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ وہ اکثر حالات میں کمزور فریق کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ نام نہاد بڑے گروہ کے مقابلہ میں چھوٹے گروہ کی حمایت کرتا ہے۔ یہ قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ (البقرہ ۲۴۹)

ایک کمزور گروہ اپنے مقابلہ میں طاقتور گروہ سے کیوں کر بڑھ جاتا ہے اور فطرت کا قانون کس طرح اس کا مددگار بنتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق فطرت نے پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر انتھاہ امکانات رکھ دئے ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مگر ابتدائی طور پر یہ صلاحیت سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ یہ تمام اعلیٰ امکانات اس کے اندر بالقوۃ طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا اپنا معاملہ ہے کہ وہ اس بالقوۃ (potential) کو بالفعل (actual) میں تبدیل کرے۔

یہاں دوبارہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ یہ تبدیلی دباؤ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کے اوپر حالات کا جتنا زیادہ دباؤ پڑتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ عین وہی فطری معاملہ ہے جو، مثال کے طور پر، گنے کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر گنا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ مگر معمول کے حالات میں یہ رس گنے سے باہر نہیں آتا۔ گنے کا رس صرف اس وقت اندر سے نکل کر باہر آتا ہے جب کہ اس پر غیر معمولی دباؤ پڑے۔ گنے کو اگر آپ نرم روئی میں رکھ دیں تو اس کا رس کبھی باہر نہیں آئے گا۔ لیکن جب آپ گنے کو کریشر (crusher) میں ڈالتے ہیں تو اس کے اندر بھرا ہوا میٹھا رس نکل کر باہر آجاتا ہے۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان بھی ہمیشہ دباؤ کے حالات میں ترقی کرتا ہے۔ یہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور یہی اصول جماعت کے لئے بھی۔ اس معاملہ کو مشہور برطانوی مورخ آرنلڈ جے

ٹوائن بی نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ (A Study of History) میں کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ ۱۲ جلدوں کی اس کتاب میں اس نے بتایا ہے کہ تاریخ کی تمام بڑی بڑی تہذیبوں کو جو لوگ وجود میں لائے وہ اقلیت میں تھے۔ یہ دراصل اقلیتی گروہ ہے جو تاریخ کے تمام بڑے بڑے واقعات کے پیچھے کام کرتا رہا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، اس کا اصول یہ ہے کہ اکثریتی گروہ کی طرف سے اقلیتی گروہ کو چیلنج پیش آتا ہے۔ یہ چیلنج اقلیتی گروہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں زیادہ کام کرے۔ وہ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو دوسروں سے زیادہ استعمال کرے۔ حالات کا یہ دباؤ اقلیتی گروہ کو ابھارتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہیروانہ کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ٹوائن بی نے فطرت کے اس اصول کو تاریخ کی اکیس تہذیبوں کی عملی مثال سے ثابت کیا ہے۔

فطرت کا یہی قانون ہندستانی مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ وہ اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے چھوٹے اور بڑے گروہ کے درمیان ایک موازنہ (بیلنس) قائم کئے ہوئے تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا اور یہاں جمہوری دور آیا تو انگریز کا قائم کردہ موازنہ ٹوٹ گیا۔ اب مسلمانوں کی حیثیت اقلیتی گروہ کی ہوگئی اور ہندوؤں کی حیثیت اکثریتی گروہ کی۔ اس کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہوگئے جو انگریزوں کے زمانے میں موجود نہ تھے۔

ہندستانی مسلمانوں کے لئے بظاہر یہ ایک مسئلہ تھا۔ مگر فطرت کے قانون کے مطابق وہ ایک چیلنج تھا۔ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی چھپی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کے ہم معنی تھا۔ بیداری کا یہ عمل ابتدائی طور پر ۱۹۴۷ کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ مگر اپنے پہلے دور میں وہ غیر شعوری حالت میں عمل کرتا رہا۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا اور بیداری کا یہ عمل شعوری طور پر شروع ہوگیا۔ اب یہ عمل اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ہر جگہ اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے دہلی میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کا معاشی پچھڑا

پن کیوں؟ یہاں مختلف مقرّرین نے اظہارِ خیال کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے کہ اس ملک کے مسلمان پچھڑ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ اس ملک کے تقریباً ہر مسلمان نے ۱۹۴۷ کے بعد ترقی کی ہے۔ میں نے کہا کہ صنعتی انقلاب کے بعد ساری دنیا میں اور خود ہندستان میں ایک اقتصادی انفجار (economic explosion) آیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک قسم کا خلافِ زمانہ قول ہے کہ مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے پچھڑا ہوا گروہ بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا بیان بظاہر ہی قابلِ رد ہے۔

پھر میں نے اپنی تقریر میں حاضرین کو براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جو مسلمان اس ہال کے اندر موجود ہیں، ان میں سے ہر مسلمان کی اقتصادی حالت ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر آپ میں سے کسی کا معاملہ اس سے مختلف ہو تو وہ کھڑا ہو کر میرے اس بیان کی تردید کرے۔ حاضرین میں سے کسی ایک مسلمان نے بھی یہ نہیں کہا کہ ۱۹۴۷ میں میری جو معاشی حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج میری حالت خراب ہو چکی ہے۔

میں نے اس معاملہ کا باقاعدہ سروے کیا ہے اور اپنی کتاب ''ہندستانی مسلمان'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق، ہندستان کا تقریباً ہر مسلم ادارہ، ہر مسلم جماعت، ہر مسجد اور ہر مدرسہ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج دگنا اور چوگنا ترقی کر چکا ہے۔ تقریباً ہر مسلم خاندان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ تعلیم اور اقتصادیات کے میدان میں ہندستانی مسلمان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ یہ ترقی اتنا عام ہو چکی ہے کہ کسی بھی مسلم خاندان کا جائزہ لے کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ کی ایک چشم کشا مثال وہ ہے جو جولائی ۱۹۹۹ میں سامنے آئی۔ نیویارک کے مشہور اقتصادی میگزین فوربس (Forbes) نے ساری دنیا کے ارب پتیوں کا سروے کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے ہندستان کے ارب پتیوں کا بھی سروے کیا۔ اس سروے کے نتائج فوربس میگزین کے شمارہ ۵ جولائی ۱۹۹۹ میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہندستان کے تمام اخباروں،

مثلاً ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، وغیرہ میں نقل ہوئے۔

فوربس میگزین کے سروے کے مطابق اس وقت ہندستان کے ارب پتیوں (billionaires) میں جو آدمی نمبر ایک پر ہے وہ بنگلور کا ایک مسلمان ہے جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے دس انتہائی بڑے دولت مندوں میں سے تین آدمی مسلمان ہیں۔ انٹیلی جنٹ انوسٹر (Intelligent Investor) کے شمارہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ایٹ دی ٹاپ (At The Top) کے عنوان سے چھپی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی کے شمارہ ۲۷ جون ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ویری رچ (Very Rich) کے عنوان سے چھپی ہے۔ دوسرے اخباروں میں یہ رپورٹ رچسٹ انڈین (Richest Indian) وغیرہ عنوانات کے تحت شائع ہوئی ہے۔

بے قیمت الفاظ

آپ بینک کے ذریعہ کسی شخص کو کچھ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو آپ اتنی ہی رقم کا ایک چک دیتے ہیں۔ یہ چک صرف اس وقت کار آمد ہے جب کہ بینک کے یہاں آپ کے کھاتہ میں اتنی مقدار میں رقم موجود ہو جتنی آپ نے چک کے کاغذ پر لکھی ہے۔

اگر بینک کے یہاں آپ کے کھاتہ میں ضروری رقم نہ ہو اور آپ کسی کو چک لکھ کر دے دیں تو ایسے چک کی کوئی قیمت نہیں۔ کیوں کہ اس چک کی بنیاد پر بینک رقم کی ادائیگی نہیں کرے گا۔ آپ کا اس قسم کا چک صرف ایک بے قیمت کاغذی پرزہ ہے نہ کہ فی الواقع بینک چک۔ ایسے چک کو بینک کی اصطلاح میں بے کار چک (Dud cheque) کہا جاتا ہے۔

جب آپ کسی سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ آپ کے بارے میں کوئی امید قائم کرے تو گویا آپ اس کو اپنا ایک چک دیتے ہیں۔ ایسے چک کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ آپ کے الفاظ کو وہ عمل کے وقت کیش کرا سکے۔ اگر ایسا ہو کہ عمل کا وقت آنے پر آپ اپنے قول کے تقاضے پورے نہ کریں تو گویا کہ آپ نے اپنے بھائی کو ایک بے کار چک دے دیا۔ آپ اس سے ایسے الفاظ بولے جن کے پیچھے آپ کے اخلاقی کھاتے میں عمل کی ضروری مقدار موجود نہ تھی۔

کسی قوم پر جب زوال کا وقت آجائے تو اس کا ہر فرد اسی قسم کے بے کار چک تقسیم کرنے کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ اب ہر شخص ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جس کے بارہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق اس کے اندر یہ مضبوط ارادہ موجود نہیں ہوتا کہ وہ ان الفاظ کو عمل کی صورت میں پورا کرے گا۔

اس قسم کی لفظی فیاضی قرآن کی اس آیت کی مصداق ہے کہ وہ اپنی زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں (آل عمران ۱۶۷) یعنی ایسے لوگ بظاہر بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں مگر وہ اپنے بول میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ان کے اندر یہ پختہ ارادہ نہیں ہوتا کہ انھیں اپنے ان الفاظ کو عملاً پورا کرنا ہے۔ وہ صرف کہنے کے لیے کہہ دیتے ہیں، وہ کرنے کے لیے نہیں کہتے۔

اس روش کو قرآن میں منافقین کا طریقہ بتایا گیا ہے اور منافقین کے بارے میں قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہ آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے (النساء ۱۴۵)

سکون کا سرچشمہ

مسٹر نٹور سنگھ (۷۱ سال) انڈیا کے ایک ممتاز لیڈر ہیں۔ وہ اپنے وسیع مطالعہ کے لیے مشہور ہیں۔ اُن کے ساتھ ایک شدید خاندانی حادثہ ہوا۔ اُن کی جوان بیٹی ریتو اور ان کی جوان بہو نتاشا صرف ایک مہینہ کے وقفہ سے حادثہ کا شکار ہو کر مر گئیں۔ اس کے فوراً بعد کانگریس کی صدر مسز سونیا گاندھی تعزیت کے لیے نئی دہلی میں اُن کے گھر گئیں۔ اُس وقت مسٹر نٹور سنگھ اپنے کمرۂ مطالعہ (study) میں تھے۔ یہاں انہوں نے دنیا بھر کی دس ہزار منتخب کتابیں اکٹھا کی ہیں۔ مسٹر نٹور سنگھ نے اُن کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسز سونیا گاندھی سے کہا کہ ان کتابوں میں ملکی حکمت موجود ہے۔ صدیوں کی حکمت کا خلاصہ یہاں پایا جاتا ہے۔ مگر یہاں ایک بھی ایسی کتاب موجود نہیں جس کو پڑھ کر میں اپنے آپ کو تسکین دے سکوں:

Here you have the wisdom of the world, wisdom of the ages in concentrated form, but there is not a book I could pick up to console myself. (*Hindustan Times,* New Delhi, June 2, 2002, p. 14)

مسٹر نٹور سنگھ کیوں اپنے کمرۂ مطالعہ میں وہ کتاب نہ پاسکے جو اُنہیں مذکورہ حادثۂ موت کے موقع پر تسکین دے۔ اس کا جواب خود اس انٹرویو کے اندر موجود ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر نٹور سنگھ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں مذہب میں یقین نہیں رکھتا، البتہ میں روحانیت کو مانتا ہوں۔

I don't believe in religiosity. I believe in spiritualism.

مذہب کا فکری نظام خدا کے تصور پر قائم ہے، اور روحانیت کا فکری نظام خود انسان کے اپنے تصور پر۔ خدا کے عقیدہ سے الگ ہو کر روحانیت کا جو تصور ہے وہ اس مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان کے اپنے اندر امکانی طور پر سب کچھ چھپا ہوا ہے، اس لیے تم اپنی داخلی دنیا میں دھیان لگاؤ۔ وہاں تم کو سب کچھ مل جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان کو جو کچھ پانا ہے وہ خود اپنے آپ سے پانا ہے۔ یہ

ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو انسان مسئلہ کا شکار ہو وہ خود ہی اپنے مسئلہ کا حل کیسے بنے گا۔

مذہب جس کی نمائندگی اسلام کرتا ہے، اُس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مذہب اسلام کا فکری نظام خدا کے تصور پر قائم ہے، یعنی وہ ذات جو قادر مطلق ہے اور جس نے انسان کو قرآن کی صورت میں کامل رہنمائی عطا فرمائی ہے۔

قرآن میں مذکورہ قسم کے مسئلہ کا حل واضح طور پر ملتا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک براہِ راست حوالہ یہ ہے— **ولکل امة اجل فاذا جاء اجلهم لا یستأخرون ساعة ولا یستقدمون** (الاعراف ۳۴) یعنی ہر امت (اور ہر انسان) کے لیے ایک مقرر مدت ہے۔ جب اُن کی مدت پوری ہو جائے گی تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

اس قرآنی تصور کے مطابق، ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے وہ صرف اس لیے آتا ہے کہ وہ ایک مقرر مدت پوری کرنے کے بعد یہاں سے چلا جائے۔ گویا انسان کی موت ایک ایسا واقعہ ہے جو بہر حال ہونے والا تھا اور وہ ٹھیک اپنے وقت پر ہو گیا۔ اس اعتبار سے موت ایک فطری حقیقت ہے، ایک ایسی فطری حقیقت جس کی تبدیلی پر انسان قادر نہیں۔

یہ عقیدہ انسان کے اندر اعترافِ حقیقت کا ذہن پیدا کرتا ہے، اور حقیقت کا اعتراف اپنے آپ انسان کو وہ چیز دے دیتا ہے جس کو مسٹر نٹور سنگھ نے تسلّی (console) سے تعبیر کیا ہے۔

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آدمی کے ساتھ اگر کوئی چیز حسب توقع پیش آئے تو اُس کا ذہن پیشگی طور پر اُس کا استقبال کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ایسی چیز کو وہ معتدل انداز میں قبول کر لیتا ہے۔ البتہ اگر پیش آنے والا واقعہ اُس کے لیے غیر متوقع ہو تو اُس کا ذہن پیشگی طور پر اُس کی قبولیت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر ایک انسان موت کے حادثہ کو معمول کے واقعہ کے طور پر لیتا ہے۔ اور دوسرے انسان کے ساتھ جب موت کا واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اُس کے لیے ایک ایسے صدمہ (shock) کا سبب بن جاتا ہے جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے۔

درخت کی مثال

درخت خدا کی ایک انڈسٹری ہے۔ درخت کا آغاز ایک چھوٹے بیج سے ہوتا ہے۔ بیج کے اندر وہ تمام امکانات نہایت کاریگری کے ساتھ سموئے ہوتے ہیں کہ جب بھی اس کو موافق حالات ملیں وہ ایک درخت کی صورت میں اپنے کو ظاہر کرنا شروع کر دے۔

بیج کے بونے کی جگہ مٹی ہے۔ آپ بیج کو پتھر میں ڈال کر اس کے متوقع نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ بیج کو جب مٹی میں ڈالا جاتا ہے تو اچانک وہ پوری کائنات سے اس طرح جڑ جاتا ہے جیسے کہ ساری کائنات صرف اسی کی پرورش کے لئے بنائی گئی تھی۔ مٹی نرم ہو کر اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اس کے اندر اپنی جڑیں داخل کرے۔ بیکٹیریا کروڑوں کی تعداد میں اس کے جڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ فضا سے نائٹروجن الگ کر کے اس کی خوراک فراہم کریں۔ زمین کی تہیں اپنی معدنیات اور نمکیات کو پانی میں گھول کر اس کی جڑوں کو پہنچاتی ہیں تاکہ وہ کھنچ کھنچ کر اوپر کی طرف جائے اور درخت کی نشو و نما کا ذریعہ بنے۔ زمین سے لے کر سورج تک کائنات کا پورا کارخانہ متحرک ہو جاتا ہے تاکہ اس کے لئے مختلف موسم پیدا کرے اور گرمی اور سردی اور بارش کے حالات سے گزارتے ہوئے اس کو ایک مکمل درخت کی صورت میں کھڑا کر دے۔

یہ درخت پوری کائنات سے اس طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہ کہیں بھی ماحول کی دوسری چیزوں سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر زمین سے پانی لیتا ہے تو خود بھی زمین سے لی ہوئی رطوبت کو اپنے پتوں کے ذریعہ خارج کر کے بارش کے عمل میں معاون بنتا ہے۔ وہ اگر زمین سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے تو خود بھی اپنے پتوں اور پھولوں کو زمین پر گرا کر اس کی زرخیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اگر ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ لیتا ہے تو ایک اور مفید چیز آکسیجن کی صورت میں اسے لوٹا دیتا ہے۔ وہ کائنات سے الگ ہوتے ہوئے پوری کائنات سے اس طرح جڑا ہوا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے بھی کبھی اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

درخت سایہ تلاش کرنے والے کے لئے سایہ مہیا کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس سے گزرنے والوں کے لئے مہک اور سرسبز منظر کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ جو شخص اس سے غذا حاصل کرنا چاہے اس کے لئے اس کے پاس لذیذ پھل موجود ہوتا ہے۔ حتی کہ جو لوگ اس کو کاٹ ڈالتے ہیں ان کو بھی وہ لکڑی مہیا کرتا ہے جس سے وہ اپنی مختلف تمدنی ضرورتوں کو پوری کریں۔ جب بھی تجربہ کا کوئی لمحہ آتا ہے تو درخت عین وہی ثابت ہوتا ہے جس کی اس سے امید کی گئی تھی۔

ان سب کے ساتھ درخت ایک ایسا وجود ہے جو زمین میں اپنی جڑیں داخل کرکے خود اپنے بل پر کھڑا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا تقریباً نصف حصہ سطح زمین کے نیچے ہوتا ہے اور نصف حصہ سطح زمین کے اوپر۔ وہ زمین کی تہوں میں اس طرح گڑا ہوا ہوتا ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے اور فضا میں اس طرح بلند ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں سے بے روک ٹوک اپنا رزق حاصل کرے۔

قرآن میں مومن کی مثال درخت سے دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔ مومن وہ ہے جس کے اندر وہی صفتیں انسانی سطح پر موجود ہوں جو درخت کے اندر مادی سطح پر پائی جارہی ہیں۔ مومن کو وہی کام شعور کے تحت کرنا ہے جس کو درخت طبعی قانون کے تحت انجام دے رہا ہے۔ مومن کو خود اپنے ارادہ سے اسی سرسبز دنیا کی تخلیق کرنی ہے جس کو درخت نظام قدرت کی پابندی میں جبراً وجود میں لاتا ہے۔

عام درخت مٹی کے اندر سے نکلتا ہے۔ مومن کا درخت روحانیت کی ربانی زمین پر اگتا ہے۔ ایک دنیا کے مادی اجزاء سے بنتا ہے اور دوسرا عالم آخرت کے جنتی اجزاء سے۔ عام درخت مادی دنیا کا درخت ہے تو مومن انسانی دنیا کا درخت۔

درخت ایک نمو پذیر وجود ہے، اسی طرح مومن بھی ایک نمو پذیر وجود ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو ربانی فکر کی بنا پر اس قابل ہو جاتا ہے کہ پوری کائنات اس کے لئے معرفت کا دسترخوان بن جائے۔

فلسفۂ صحبت

''ایک بڑا سائنسداں جو چیز اپنے شاگرد کو دیتا ہے، وہ ایک ذہنی رجحان (attitude of mind) ہے۔'' ایک مبصر نے یہ بات نوبل انعام پانے والوں کی ایک جماعت کا جائزہ لینے کے بعد لکھی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کسی سائنسداں کو نوبل انعام پانے کے قابل بنانے والی چیز یہ نہیں ہے کہ اس کو کہیں سے سائنسی معلومات کا بڑا ڈھیر حاصل ہو گیا تھا۔ وہ چیز جس نے اس کو اس عالمی اعزاز کا مستحق بنایا، وہ صرف اخذ و مطالعہ کا ایک ذہنی رجحان تھا جو کسی بڑے سائنسداں کی صحبت سے اسے ملا تھا۔ اسی چیز نے بالآخر اس کو ترقی کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

صوفیاء کے یہاں جس چیز کو صحبت کہا جاتا ہے اس کی اصل بھی یہی ہے۔ یہ صحبت کوئی پراسرار چیز نہیں۔ یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ مذہبی شخصیت کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اور غیر مذہبی شخصیت کے یہاں بھی۔

ایک شخص جس نے لمبی جدوجہد کے بعد علم اور تجربہ میں اپنا حصہ پایا ہو اس کی ہر بات گہرے معانی لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو وہ علوم کے سرے کو بتاتا ہے۔ وہ جب تبصرہ کرتا ہے تو اس کا تبصرہ ایک بڑے ذخیرۂ کتب کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہ جب اپنے تجربات بیان کرتا ہے تو وہ برسوں کے درمیان پھیلے ہوئے سفر کو چند منٹوں میں سمیٹ رہا ہوتا ہے۔ وہ جب مشورہ دیتا ہے تو اس کے مشورہ کے پیچھے نشیب و فراز اور کامیابی و ناکامی کی طویل کہانی چھپی ہوئی ہوتی ہے جس سے وہ گزر چکا ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک کتاب ہوتا ہے، اس کی ہر تقریر ایک پورے کتب خانہ کا خلاصہ ہوتی ہے۔ اس کا بولنا پوری تاریخ کا بولنا ہوتا ہے اور اس کا سوچنا پورے عالمِ بشری کا سوچنا۔

یہی فلسفہ صحبت کا خلاصہ ہے۔ زیر صحبت آدمی اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ صاحب صحبت نے جو چیز ایک عمر صرف کر کے حاصل کی ہے، اس کو وہ چند لمحاتِ صرف کر کے حاصل کر لے۔

زیر صحبت آدمی صاحب صحبت سے صرف علم حاصل نہیں کرتا، اسی کے ساتھ، وہ ایک زاویہ نظر

بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ صرف معلومات نہیں لیتا بلکہ وہ اسی سے تڑپ بھی پاتا ہے۔ اس کو صرف یہ فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ کتابوں اور مصنفوں کے نام سن کر اپنی فہرست مکمل کر لے بلکہ اس کی صحبت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ علم کی ہواؤں میں سانس لے اور معرفت کے سمندروں میں نہائے۔ تاہم یہ فائدہ صرف حقیقی طالب کے لئے ہے نہ کہ محض ظاہری طور پر صحبت میں بیٹھنے والے کے لیے۔

قرآن میں اہل ایمان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے "یاایها الذین آمنوا اتقوا الله وکونوا مع الصادقین (التوبہ ١١٩) یعنی اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ یہ سچے لوگ یا صادقین کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ (استوت ظواهرهم وبواطنهم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی۔ ٢٨٩/٨

اس قسم کے صادقین کی صحبت میں بیٹھنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ہر بیان مبنی بر حقیقت ہوتا ہے۔ وہ وہی کہتے ہیں جو انہیں کہنا چاہئے، وہ وہی بولتے ہیں جو انہیں بولنا چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کے اندر سچائی کا مزاج پرورش پاتا ہے۔ وہ بے بنیاد باتوں میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے والے بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف ابھرتے ہیں۔ ان کی نیتوں میں پاکی اور ان کے قول میں سنجیدگی آجاتی ہے۔

ایسے لوگ بے حد نادر الوجود ہیں جو صحبت سے یا اپنے ماحول سے اثر نہ لیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہی ہے کہ وہ دوسروں سے اثر لیتے ہیں۔ وہ ویسے ہی بن جاتے ہیں جیسا کہ ان کے گرد و پیش کا ماحول ہو۔ اس لئے آدمی کو صحبت کے معاملہ میں بے حد محتاط رہنا چاہئے۔ قرآن کے مطابق قابل صحبت آدمی وہ ہے جس کے ظاہر اور باطن میں فرق نہ پایا جاتا ہو۔

مثبت انداز میں سوچنا

دور اول کے مسلمانوں نے جو بے نظیر کامیابی حاصل کی اس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ ان میں کا ہر فرد مکمل معنوں میں مثبت سوچ (Positive Thinking) کا مالک تھا۔ وہ قرآن کے مطابق عسر میں یسر کا پہلو تلاش کر لیتا تھا۔ وہ بظاہر شکست کے واقعہ میں فتح کا راز دریافت کر لیتا تھا۔ اس کے لئے پوری دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ مثبت خوراک کا دستر خوان بن گئی تھی۔ مسلمانوں کا یہی مزاج تقریباً ہزار سال تک جاری رہا۔ انیسویں صدی میں جب مسلم سلطنتیں اہل مغرب کے ہاتھوں ٹوٹ گئیں تو اس کے بعد جو مسلم رہنما اٹھے وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے دور جدید کی مسلم نسلوں کو احتجاجی ذہن میں مبتلا کر دیا۔ ساری دنیا کے مسلمان، خواص اور عوام دونوں احساس محرومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہو گئے۔ اس نازک تاریخی موقع پر مسلم رہنماؤں کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو گئے جس کو انگریزی میں پیرانوئیا (Paranoia) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار کر لیں گے اور اگر وہ فلاح کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار نہ کریں گے (الاعراف۔ ۱۴۶)

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ لوگ منفی پکار کی طرف تیزی سے دوڑتے ہیں، مگر مثبت پکار کی طرف وہ اس طرح نہیں دوڑتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ منفی کلام حال کی زبان میں ہوتا ہے اور مثبت کلام ہمیشہ مستقبل کی زبان میں، اور تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ مستقبل کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور حال کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت زیادہ۔

اس دنیا میں ہر قسم کی ناکامیوں کا راز منفی طرز فکر ہے اور ہر قسم کی کامیابی کا راز مثبت طرز فکر۔ منفی طرز فکر ہر قسم کی دینی اور اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے اور مثبت طرز فکر اس کے مقابلے میں ہر قسم کے دینی اور دنیوی خیر کا سرچشمہ۔

اتحاد میں خدا کی مدد

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الله عزوجل: انا ثالث الشريكين مالم يخن احدهما صاحبه (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں دو شریکوں کے ساتھ تیسرا ہوتا ہوں، جب تک ان میں کا کوئی ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے۔

اس حدیث کو لفظی طور پر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دو آدمی اگر خدا کے لیے آپس میں متحد ہو جائیں تو ان کے ساتھ خدا خود ایک تیسرے رکن کی حیثیت سے شریک ہو جاتا ہے اور جس اتحادی مجموعہ میں خود خدا شریک ہو جائے اس کی طاقت بلاشبہہ بے پناہ حد تک بڑھ جاتی ہے۔ ان کا اتحاد ناقابل تسخیر حد تک مضبوط ہو جاتا ہے۔

یہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ صرف اللہ کی خاطر متحد ہوں تو ان کی نفسیاتی حالت عام لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے کو اپنی ذات کی نظر سے دیکھنے کے بجائے خدا کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ انھیں اگر اپنے ساتھی سے کوئی شکایت ہو تو وہ یہ سوچ کر اسے بھلا دیتے ہیں کہ میں تو خدا کے لیے متحد ہوا ہوں نہ کہ کسی انسان کے لیے۔ کسی موقع پر اگر ان کی انا کو چوٹ لگتی ہے تو وہ اس کا اثر نہیں لیتے کیوں کہ وہ پہلے ہی اپنی انا کو خدا کے لیے چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں انھیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ میں نے آخرت کا فائدہ لینے کے لیے اس اتحاد میں شرکت کی ہے نہ کہ دنیا کا فائدہ لینے کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے لیے متحد ہونا اپنے آپ میں ایک طاقت ہے۔ خدا کے لیے متحد ہونے والے لوگوں میں وہ مزاج بن جاتا ہے جو اختلاف کا قاتل ہے۔ یہ ربانی مزاج اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ کوئی بھی اختلافی سبب ان کے اتحاد کو نہ توڑے۔ وہ تمام اختلافات کو بھلا کر

پوری مضبوطی سے اتّحاد کی رسّی کے ساتھ بندھے ہوئے رہیں۔

اتحاد کی یہ برکت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اتّحادیوں میں خیانت کی ذہنیت نہ پیدا ہو۔ خیانت کیا ہے۔ خیانت یہ ہے کہ ایک شریکِ اتّحاد دوسرے شریکِ اتّحاد کا خیر خواہ نہ رہے، ایک شریکِ اتّحاد، دوسرے شریک اتّحاد کو غیر سمجھ لے۔ جب لوگوں میں یہ نفسیاتی برائی آجائے تو لوگوں کے دل ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کو اپنا سمجھنے کا مزاج باقی نہیں رہتا۔ وہ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو ان کے اتحاد کی تمام اینٹیں ہل جاتی ہیں۔ ان کا آپس کا جوڑ ختم ہو جاتا ہے۔ اتّحاد کے افراد پہلے اگر جمی ہوئی اینٹوں کے مانند تھے تو اب وہ بکھری ہوئی اینٹوں کے مانند ہو جاتے ہیں۔ اب ان کا اتحاد بھی ختم ہو جاتا ہے اور ان کی طاقت بھی۔

اتحاد پیدا ہونا نہایت آسان ہے، مگر اتحاد کو باقی رکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اتحاد کے بعد لازماً آپس میں شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے نقصان پہنچتا ہے۔ اب لوگوں کے لیے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک خیانت کا اور دوسرا اخلاص کا۔ اتحادی افراد میں جب خیانت کا مزاج آجائے تو ان کی شکایتیں بڑھتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ ان کا اتّحاد ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جب لوگوں میں اخلاص کا مزاج ہو تو ہر شکایت پیدا ہوتے ہی وہ ختم ہو جائے گی۔ کوئی بھی شکایت اختلاف کے درجے تک نہ پہنچے گی۔

کام کی عظمت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھی کمائی کون سی ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ...... آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا (سئل النبی صلی الله علیه وسلم عن أفضل الکسب فقال...... وعمل الرجل بیده) مسند الامام احمد، الجزء الثالث، صفحہ ۴۶۶۔

اس حدیث میں کام کی عظمت (dignity of work) کو بتایا گیا ہے۔ اسلام میں اس بات کی بے حد اہمیت ہے کہ آدمی خود کام کرے اور ہمیشہ اپنے آپ کو کام میں مشغول رکھے۔ یہ اسلامی مزاج کے سراسر خلاف ہے کہ کسی کام کو چھوٹا کام سمجھا جائے یا کسی کام کے کرنے میں شرم محسوس کی جائے۔ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام پیغمبر اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ حضرت داؤد اگر چہ بادشاہ تھے مگر وہ بھی اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنا پسند کرتے تھے۔

کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ ہر کام کام ہے، اور اس قابل ہے کہ اس کو کیا جائے۔ جب ایک آدمی کوئی کام کرتا ہے تو وہ صرف کام نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے آپ کو بے کاری سے بچاتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ میرے اندر یہ عظیم انسانی اسپرٹ زندہ ہے کہ میں جب کسی کام کو دیکھوں تو فوراً خود اس کو انجام دوں۔ جب کوئی کام سامنے آجائے تو میرے اندر یہ اسپرٹ جاگ اٹھے کہ میں اس کام کو انجام دوں گا:

I will do it.

ایک آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنی شخصیت کو بتا رہا ہوتا ہے۔ کام کرنا کام کرنے والے کی شخصیت کا تعارف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرض شناس (duty conscious) آدمی ہے۔ اس کے اندر سنجیدگی ہے۔ اس کے اندر ذمہ داری کا احساس ہے۔ اس کے اندر کر ڈالنے کا جذبہ ہے۔ وہ سست اور کاہل آدمی نہیں۔ وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو لے کر بے کار پڑا رہے۔ اس کی لذت کام میں ہے نہ کہ بے کار رہ کر وقت گزارنے میں۔

غلط فہمی

یہ ۱۳ مارچ ۲۰۰۲ کا واقعہ ہے۔ نئی دہلی کے کیٹ آفس (CAT office) میں ڈاکٹر شمس الآفاق خاں اپنے کام سے گئے ہوئے تھے۔ وہاں حسب معمول دوسرے بہت سے لوگ تھے۔ ایک آدمی ان کے سامنے تھا۔ ڈاکٹر صاحب آگے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس آدمی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا کہ مجھے راستہ دے دو۔

آفس میں اپنے کام سے فارغ ہو کر جب وہ نکلے تو گیٹ کے باہر دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک وہی شخص تھا جس کی پیٹھ پر ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ رکھا تھا۔ اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ دونوں صورت سے جاٹ معلوم ہوتے تھے۔

مذکورہ آدمی نے جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کو دیکھا وہ اچانک بگڑ گیا۔ وہ نہایت اشتعال انگیز لہجہ میں ان کو برا بھلا کہنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے کہا کہ راجندر، تم کیا سمجھتے ہو، میں تم کو گولی مار دوں گا۔ ڈاکٹر شمس الآفاق صاحب اعراض کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اب تک بالکل خاموش تھے۔ جب اس آدمی نے راجندر کا نام لیا تو انہوں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ غلط فہمی کا معاملہ ہے۔ ابھی وہ چپ ہی تھے کہ ان کے ساتھی مسٹر اشوک کمار نے کہا کہ بھائی، تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو ڈاکٹر شمس الآفاق ہیں۔ اور یہ فلاں سرکاری محکمہ میں افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس آدمی کو یقین نہیں آیا۔ شاید اس کے مفروضہ راجندر کی صورت ڈاکٹر صاحب سے کچھ ملتی جلتی تھی۔ اس کی طلب پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی جیب سے اپنا آئڈنٹٹی کارڈ نکالا اور اس آدمی کو دکھایا۔ آئڈنٹٹی کارڈ کو دیکھتے ہی وہ ایسا ہو گیا جیسے پھولے ہوئے غبارہ کی ہوا اچانک نکل گئی ہو۔ اور پھر وہ سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔

اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے خلاف برا برتاؤ کرے تو فوراً اس کو اپنا دشمن نہ سمجھ لیجئے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے برے برتاؤ کا سبب اس کی غلط فہمی ہو۔ اگر آپ صبر و اعراض کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اس سے نرمی کا معاملہ کریں تو عین ممکن ہے کہ آپ کی صحیح تصویر کو

جاننے کے بعد اس کا رویہ بالکل بدل جائے۔ گولی مارنے کی بات کرنے والا آدمی آپ کو پھول کی پیش کش کرنے لگے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ بے صبری کا انداز آدمی کے نفس امّارہ کو جگاتا ہے۔ اس کے برعکس صبر کا انداز اس کے نفس لوّامہ کو جگا دیتا ہے۔ نفس امّارہ کا جاگنا آدمی کو آپ کا دشمن بنا دیتا ہے۔ اور نفس لوّامہ کا جاگنا آدمی کو آپ کا دوست بنا دیتا ہے۔

انسانی زندگی میں غلط فہمی پیدا ہونا ایک عام بات ہے۔ کسی بھی شخص کو کسی بھی شخص کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے غلط فہمی پیدا ہونا بذاتِ خود کوئی جرم نہیں۔ جرم یہ ہے کہ غلط فہمی پیدا ہونے کے بعد وہ درست رویہ اختیار نہ کرے۔

اگر کسی شخص کو کسی کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو جائے تو صرف غلط فہمی کی بنیاد پر اسے مان نہیں لینا چاہئے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ معاملہ کی تحقیق کرے۔ تحقیق کے بعد اگر وہ بات غلط ثابت ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس کو مکمل طور پر اپنے دل سے نکال دے۔

غلط فہمی کی تحقیق سے پہلے اس کا چرچا کرنا سخت گناہ ہے۔ ایک آدمی کسی کے بارے میں تحقیق کے بغیر بھلی بات تو کہہ سکتا ہے مگر تحقیق کے بغیر بری بات کہنا سرتاسر حرام ہے۔ ایسی روش پر اللہ کے یہاں سخت پکڑ کا اندیشہ ہے۔

خدا کا پسندیدہ معاشرہ وہ ہے جس میں لوگوں کے باہمی تعلقات حسن ظن کی بنیاد پر قائم ہوں۔ کسی کے بارے میں کوئی بری بات معلوم ہو تو تحقیق کے بغیر ہی اس کو رد کر دیا جائے۔ اس قسم کی باتیں براہِ راست طور پر آخرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی لوگوں کے عیبوں کی پردہ پوشی کرے، خدا آخرت میں اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرے گا۔

دوسروں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ ایسا آدمی گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے بندوں کے ساتھ بہتر معاملہ کیا، تو بھی میرے ساتھ بہتر معاملہ فرما، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

طلبہ کے نام

صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت آئی ہے۔ اس میں مسلم عاقل کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس کو اپنے زمانہ سے باخبر ہونا چاہئے۔ **(ان یکون بصیرا بزمانه)**۔

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ صرف واقفِ دین نہ بنیں، بلکہ اسی کے ساتھ واقفِ زمانہ بھی بنیں۔ اس کے بعد ہی آپ موجودہ زمانہ میں دین کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں۔

واقف زمانہ بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی کمیونٹی کے خلاف ہونے والے ''ظلم اور سازش'' کو جاننے والے بن جائیں۔ یہ میرے نزدیک سطحیت ہے نہ کہ علم۔ یہ ظواہر کو جاننا اور حقائق سے بے خبر رہنا ہے۔ اور علم بلاشبہہ یہ ہے کہ آدمی اصل حقیقت کو جانے، نہ یہ کہ اس کی نگاہ ظاہری چیزوں پر اٹک کر رہ جائے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف سازش اور ظلم میں مصروف ہیں، تب بھی اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جنہوں نے ان قوموں کو یہ حیثیت دے دی کہ وہ ہمارے خلاف کامیاب سازشیں کر سکیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنے ظالمانہ منصوبوں کی کامیاب تعمیل کریں اور ہمارے تمام اعاظم واکابر اس کو روکنے میں مکمل طور پر عاجز ثابت ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر سے ناواقف ہیں۔ وہ ماضی کو جانتے ہیں، مگر حال کی انہیں مطلق خبر نہیں۔ ان میں سے کوئی شخص اگر کچھ جانتا ہے تو وہ بھی کچھ ظاہری چیزوں کو جانتا ہے، نہ کہ گہرے معنوں میں حقیقی حالات کو۔

دینی مدرسوں کے طلبہ اگر صرف ''حیوان کاسب'' بن کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسلام اور ملت اسلام کے احیاء میں مفید طور پر لگائیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ عصر حاضر کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ جانیں، وہ موجودہ زمانہ کی ان تبدیلیوں سے واقفیت حاصل کریں جنہوں نے ہمارے مروجہ طریقوں کو عملی اعتبار سے بالکل غیر موثر بنا دیا ہے۔

جدید دعوتی امکانات

انگلینڈ کی مشہور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامی مطالعہ کا ایک ادارہ کھلا ہے جس کا نام ہے:

Oxford Centre of Islamic Studies

اس کے افتتاحی اجلاس میں پرنس چارلس نے شرکت کی اور وہاں ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک مفصل تقریر کی۔

انھوں نے کہا کہ جس زمانہ میں ہمارے ملک میں کنگ الفرڈ مطبخی موضوعات پر کتابیں جمع کر رہے تھے اسپین کے مسلمان علم کو ترقی دینے میں مصروف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسپین کے سلطان کے کتب خانہ میں اس وقت چار لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ یہ بقیہ یورپ کے تمام کتب خانوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھیں۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ مسلم دنیا نے چین سے کاغذ بنانے کا فن مسیحی یورپ سے چار سو سال پہلے حاصل کر لیا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب نے جو مزاج پیدا کیا ہے اس کا ایک پہلو کھلا پن ہے۔ مذکورہ اقتباس اسی کی ایک مثال ہے۔ پرنس چارلس کے الفاظ خود اپنی قوم کے خلاف ایک بیان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے نہایت کھلے طور پر اس پر اظہار خیال کیا۔ اور اس معاملہ میں مغرب کی کوتاہی اور اسلام کی برتری کی تصدیق کی۔

مغربی انسان کا یہ مزاج ہمارے لیے ایک عظیم دعوتی امکان ہے۔ شکایتی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر خالص دعوتی ذہن سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل مغرب اسلام کے لیے بہترین مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغربی انسان کا غیر تقلیدی مزاج، اس کا کھلا پن اور اس کے اندر اعتراف کرنے کی اسپرٹ، اسلام کے لیے ایک موافق زمین کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان بالقوۃ طور پر دین فطرت کے قریب آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اس بالقوہ کو بالفعل میں تبدیل کر دیا جائے۔

مسلسل کوشش

سید فرید الوحیدی (پیدائش ۱۹۳۰) مشہور مجاہد آزادی مولانا وحید احمد مدنی (وفات ۱۹۳۸) کے صاحبزادے ہیں۔ مولانا مرحوم برٹش دور میں ان علماء کے ساتھ تھے جن کو مالٹا میں نظر بند (۲۰۔1918) کیا گیا تھا۔ جناب سید فرید الوحیدی صاحب نے ابتدائی تعلیم دار العلوم دیوبند میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ اس کے علاوہ بی یڈ بھی کیا۔ ان کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ اپنی بی ایڈ کی ڈگری کو استعمال کر کے کسی اسکول یا کالج میں ملازمت حاصل کر لیں۔ یہ ان کے لئے سہولت کی زندگی ہوتی۔ مگر سہولت کو ترک کر کے انھوں نے محنت کا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے ملازمت کے بجائے تجارت کو اپنی جدوجہد کا میدان بنایا۔ اب وہ س حدیث رسول کی ایک زندہ تفسیر ہیں کہ: تسعة اعشار الرزق في التجارة (رزق کا ۹۰ فیصد حصہ تجارت میں ہے)۔

تاہم اپنے حالات کے اعتبار سے تجارت کو اختیار کرنا ان کے لئے آسان راستہ کو چھوڑ کر مشکل راستہ کو اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ تجارت کے لئے سرمایہ درکار تھا۔ اور ان کے پاس سرمایہ موجود نہ تھا۔ مگر انھوں نے اپنے عمل سے اس مشہور مقولہ کی صداقت کو ثابت کر دیا کہ ــــ محنت ہر چیز کا بدل ہے۔

جب ان کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی، انھوں نے سرمہ سے اپنی تجارت کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کے پاس کوئی رقم نہ تھی۔ انھوں نے کسی سے دس روپیہ بطور قرض حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سرمہ کی ڈلیاں خریدیں۔ کسی سے عاریۃً کھرل حاصل کیا۔ اور رات دن کی محنت سے ڈلیوں کو پیس کر سرمہ بنایا۔ پھر اس کو شیشیوں میں بھرا۔ انھوں نے اپنے سرمہ کا نام سرمہ نور رکھا۔ اس وقت کوئی دکان داران کے غیر مشہور سرمہ کو اپنی دکان پر رکھنے کے لئے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ وہ ایک دن دیوبند ریلوے اسٹیشن پر ٹرین میں سوار ہو گئے اور مسافروں کے سامنے اپنے سرمہ کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جب انھوں نے سرمہ کا تعارف کراتے ہوئے خوش آوازی کے ساتھ یہ شعر پڑھا: لگا

لو پیاری آنکھوں میں یہ ڈنڈو شاہ کا سرمہ۔ تو تمام مسافران کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور پہلے ہی دن ان کے سرمہ کی تمام شیشیاں فروخت ہو گئیں۔

سرمہ کے کاروبار میں زیادہ گنجائش نہ دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں کوئی دوسرا کام کرنا چاہئے۔ اب انہوں نے دیوبند میں کتابوں کی ایک دکان کھولی۔ اس کا نام انہوں نے قومی کتاب گھر رکھا۔ یہاں وہ کتاب فروخت کرنے لگے۔ مگر کتابوں کا کام محنت کے باوجود زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ انہیں نظر آیا کہ اس کام میں ان کے لئے موجودہ حالت میں زیادہ ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا۔ انہوں نے سیرت رسول اور تاریخ اسلام پر کئی نصابی کتابیں لکھیں جو اتنی زیادہ مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

انہوں نے محسوس کیا کہ یہ کام بھی ان کے اقتصادی حوصلوں کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۱ میں وہ ہندستان سے ایک عرب ملک میں چلے گئے۔ ابتداء میں وہاں انہوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک شہر میں ایک تجارتی کام کا آغاز کیا۔ یہ الدعایۃ والاعلان (ایڈورٹائزنگ) کا کام تھا۔ انہوں نے اپنے اس کام میں پورا اہتمام کیا کہ گاہکوں کو جو سامان سپلائی کیا جائے وہ اعلیٰ معیار کا ہو۔ یہاں تک کہ اعلیٰ معیار ان کی کمپنی الوحیدی کی پہچان بن گیا۔ ان کی کمپنی الوحیدی کے نام سے مشہور ہے۔ اب اس کے دفاتر وہاں کے تین بڑے شہروں میں ہیں۔ ۲۰ سال کی مسلسل محنت کے بعد ان کا کام اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ اب ایڈورٹائزنگ بزنس میں عرب دنیا میں ان کی کمپنی کا درجہ تیسرے نمبر پر ہے۔

ایک شخص جس نے ۱۹۵۰ میں دس روپیہ بطور قرض حاصل کر کے اپنی چھوٹی سی تجارت شروع کی تھی، وہ ۲۰۰۰ء میں اس حیثیت کو پہنچ چکا ہے کہ اب اس کے تجارتی ادارے میں ساٹھ آدمی کام کررہے ہیں۔ ان کو وہ مہینہ ایک لاکھ ریال تنخواہ دیتا ہے۔ یہ رقم ہندستانی سکہ کے اعتبار سے ۱۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہوتی ہے۔

سید فرید الوحیدی صاحب کو کامیابی اس طرح نہیں ملی کہ ان کو اچانک چھپر پھاڑ کر کوئی خزانہ مل

گیا۔ بلکہ ان کی کامیابی تمام تر محنت اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نوجوانی کی عمر میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں پڑھیں۔ ان سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کے یہ اشعار ان کی زندگی کے لئے رہنما ثابت ہوئے:

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہوگے اگر تم یونہی مستقل تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

سید فرید الوحیدی صاحب جب زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوئے تو ابتداءً تقریباً بیس سال تک انہیں مختلف قسم کے معمولی کام کرنے پڑے۔ اس زمانہ میں وہ صبح سے شام تک اکیلے محنت کرتے تھے۔ محنت کے ساتھ انہوں نے دیانت داری (honesty) کو اپنا لازمی اصول بنالیا۔ انہوں نے خود نقصان اٹھایا مگر کبھی کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ بیس سال کے بعد وہ وقت آیا جب کہ ان کا کام بڑھا اور انہوں نے مزید کارکن رکھ کر کمپنی کی صورت میں کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے شہر کی سڑکوں پر پیدل چل کر اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اب وہ اس پوزیشن میں ہو چکے ہیں کہ جدید ترین کمیونی کیشن استعمال کر کے انٹرنیشنل بزنس کر سکیں۔

۵ فروری ۲۰۰۰ کو دہلی میں سید فرید الوحیدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے جو اقتصادی ترقی حاصل کی اس کا راز کیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مختصر طور پر میری ترقی کا راز یہ تھا ـــــ سادہ زندگی اور بلند سوچ:

Simple living, high thinking

انہوں نے کہا کہ کسی بھی کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد لازمی شرط ہے اور سادہ زندگی اور بلند سوچ آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ اپنے مقصد کے لئے وہ مطلوب عمل کر سکیں جس کو مسلسل جدوجہد کہا جاتا ہے۔

اعتدال کا طریقہ

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگوں کو چاہئے کہ تم توسط و اعتدال کا طریقہ اختیار کرو (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علیکم القصد) مسند احمد ۴/۴۰۶۔

قصد یا توسط و اعتدال کا تعلق کسی ایک معاملے سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مثلاً جب آدمی چلے تو وہ اعتدال کے ساتھ چلے۔ بولے تو وہ اعتدال کے انداز میں بولے۔ عبادات میں وہ اعتدال کا طریقہ اختیار کرے۔ انفاق اور اعانت میں بھی وہ معتدل رویہ اختیار کرے، وغیرہ۔

اسی طرح جب کسی سے اختلاف ہو جائے تو اختلاف میں بھی فریقین کو چاہئے کہ اعتدال پر قائم رہیں۔ وہ اختلاف کے وقت اعتدال کی حد سے باہر نہ چلے جائیں۔

مثلاً جب دو آدمیوں میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو تو اولاً ان کو ایسا کرنا چاہئے کہ وہ سنجیدہ گفت وشنید کے ذریعہ اپنے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح اختلاف ختم ہو جائے تو بہت اچھا ہے اور اگر اختلاف ختم نہ ہو تو انہیں اختلاف کے باوجود اتحاد کے اصول پر عمل کرنا چاہئے۔ ان کو چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے یہ کہہ دیں کہ آؤ ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے:

Let's agree to disagree.

قصد و اعتدال متانت اور وقار کی روش کا دوسرا نام ہے۔ یہ کسی آدمی کے سنجیدہ مزاج ہونے کی ایک علامت ہے۔ جو آدمی اپنے قول و فعل میں اعتدال پر قائم ہو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ جذباتیت سے پاک ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو سوچ کر بولتا ہے اور جب کرتا ہے تو وہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے، وہ سطحیت پسندی سے پاک ہے۔ اس کا کردار اس کی عقل کے تابع ہے نہ کہ اس کے جذبات کے تابع۔

گھر ایک تربیت گاہ

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **خیرکم خیرکم لأهله و أنا خیرکم لأهلي** (ابن ماجہ کتاب النکاح، الدارمی کتاب النکاح) یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہو اور میں تم میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے اچھا ہوں۔

گھر کسی سماج کا ایک ابتدائی یونٹ ہے۔ جو کچھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پورے سماج میں پیش آتا ہے وہی گھر کے اندر چھوٹے پیمانہ پر پیش آتا ہے۔ آدمی کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ باہمی تعلقات کے درمیان ہوتا ہے۔ ہر گھر گویا انھی تجربات کا ایک چھوٹا ادارہ ہے اور ہر سماج انھی تجربات کا ایک بڑا ادارہ۔

ہر عورت یا مرد جب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں تو اُن کو کبھی خوش گوار تجربہ پیش آتا ہے اور کبھی ناخوشگوار تجربہ، کسی معاملہ میں اُن کے اندر نفرت کے جذبات بھڑکتے ہیں اور کبھی محبت کے جذبات، کبھی وہ خوشی سے دوچار ہوتے ہیں اور کبھی ناخوشی سے، کبھی اُن کی انا کو تسکین ملتی ہے اور کبھی اُن کی اَنا پر چوٹ لگتی ہے، کبھی وہ اعتراف کی صورت حال میں ہوتے ہیں اور کبھی بے اعترافی کی صورت حال میں، کبھی حقوق کی ادائگی کا موقع ہوتا ہے اور کبھی حقوق کے انکار کا موقع، وغیرہ۔

گھر کے اندر پیش آنے والی یہ مختلف حالتیں ہر عورت اور ہر مرد کے لیے اپنی تیاری کے مواقع ہیں۔ جو لوگ ایسا کریں کہ وہ ہمیشہ اپنے شعور ایمان کو زندہ رکھیں، وہ اپنا احتساب کرتے ہوئے زندگی گذاریں، اُن کو ہمیشہ آخرت کی پکڑ کا احساس لگا ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ جب بھی مذکورہ بالا قسم کا کوئی موقع اُن کے سامنے آئے گا تو وہ متنبہ ہو جائیں گے اور صحیح اسلامی روش کو اختیار کریں گے۔

جو عورت اور مرد اپنے گھر کے اندر اس قسم کی ہوش مندانہ زندگی گذاریں، اُن کے لیے اُن کا

گھر ایک تربیت گاہ بن جائے گا۔ اُن کے گھر کا ماحول اُنھیں ہر صبح وشام تیار کرتا رہے گا۔ اُن کی یہ زندگی اُن کے لیے اس بات کی ضمانت بن جائے گی کہ جب وہ گھر کے باہر سماجی زندگی میں آئیں تو وہ سماج کے اندر بھی اُسی طرح ایک حق پرست انسان ثابت ہوں جس طرح وہ اپنے گھر کے اندر حق پرست انسان ثابت ہوئے تھے۔

ایک آدمی جو اپنے گھر کے اندر لڑتا جھگڑتا ہو وہ اسی طرزِ زندگی کا عادی بن جائے گا۔ جب وہ اپنے گھر سے باہر آئے گا تو یہاں بھی وہ لوگوں سے لڑنے جھگڑنے لگے گا۔ اپنے آفس میں، اپنے کاروبار میں، روزمرہ کی زندگی میں وہ دوسروں کے ساتھ بھی اُسی طرح غیر معتدل انداز میں رہے گا جس طرح وہ اپنے گھر کے اندر غیر معتدل انداز میں رہ رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کے گھر کے معاملات بھی بگڑ جائیں گے اور اُس کے باہر کے معاملات بھی۔

اسی طرح کچھ ایسے لوگ ہیں جو اپنے گھر کے اندر تو غیر مہذب انداز میں رہتے ہیں لیکن جب وہ باہر آتے ہیں تو دوسروں کے ساتھ اُن کا رویّہ تہذیب اور شائستگی کا رویّہ بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کی نظر میں اچھے بنے رہیں۔ مگر یہ ایک منافقت ہے، اور اللہ کو منافقت پسند نہیں۔

کسی مسلمان پر جو دینی ذمہ داری ہے وہ صرف اس طرح ادا نہیں ہو جاتی کہ وہ مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھ لے، رمضان کے روزے رکھ لے اور مکہ جا کر حج کر لے۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ لوگوں کے ساتھ اُس کا اخلاق اچھا ہو۔ انسانوں کے ساتھ سلوک میں وہ خدائی احکام کی پابندی کرتا ہو، لوگوں کے درمیان وہ اس احساس کے ساتھ رہے کہ اُس کو اپنے ہر قول اور ہر فعل کا جواب خدا کو دینا ہے۔

موجودہ دنیا کی زندگی امتحان کی زندگی ہے۔ ایک طرح کی زندگی انسان کو جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور دوسری طرح کی زندگی اُس کو جہنم کا مستحق بنا دیتی ہے۔ زندگی کی اس امتحانی نوعیت کا تعلق گھر کے اندر کے معاملات سے بھی ہے اور گھر کے باہر کے معاملات سے بھی۔

معاشی کامیابی کا اصول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا سبب اللہ لأحدکم رزقا من وجہٍ فلا یدعہ حتی یتغیر لہ أو یتنکر لہ (مسند احمد)۔ یعنی جب اللہ تم میں سے کسی کے لیے رزق کا ایک ذریعہ پیدا کرے تو وہ اُس کو نہ چھوڑے، یہاں تک کہ اُس میں تغیر آ جائے یا وہ اُس کے لیے بہتر نہ رہے۔ جب کوئی شخص ایک معاشی کام کر رہا ہو اور اُس کے ذریعہ اُس کا رزق مل رہا ہو تو اُس کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ کسی معقول سبب کے بغیر اُس کو چھوڑ دے۔ مثلاً اُس کو اپنے صاحب معاملہ سے کوئی شکایت پیدا ہو جائے یا صاحب معاملہ کے کسی سلوک سے اُس کے جذبات کو ٹھیس پہنچے تو یہ معاشی تعلق توڑنے کے لیے کافی سبب نہیں۔ اس طرح لگے ہوئے ذریعۂ رزق کو چھوڑنا اُس کے لیے درست نہ ہوگا۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ منفی ردِّ عمل کے تحت کوئی فیصلہ نہ لے۔ بلکہ تحمل کی روش اختیار کرے۔ کیوں کہ ایسے اسباب فطری ہیں اور وہ ہمیشہ پیش آتے ہیں۔

البتہ اگر حالات میں ایسی کوئی تبدیلی آ جائے جو آدمی کے لیے کوئی حقیقی مسئلہ پیدا کر دے یا ایسی کوئی صورت پیدا ہو جائے جس میں اُس کے کام کی معاشی افادیت غیر تسلّی بخش ہو جائے تو ایسی صورت میں آدمی نیا فیصلہ لینے کا حق رکھتا ہے۔ گویا معاشی ذریعہ کو بدلنا واقعی معنوں میں کسی حقیقی عذر کی بنا پر ہونا چاہئے۔ اس قسم کا فیصلہ محض وقتی جذبہ کے تحت نہیں کیا جا سکتا۔ جذباتی فیصلہ کسی بھی معاملہ میں درست نہیں، خواہ وہ معاشی معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ۔

ایک معاشی کام کو چھوڑنا صرف اُس وقت درست ہے جب کہ آدمی کو دوسرا بہتر معاشی کام مل گیا ہو۔ اگر وہ اپنے موجودہ کام سے مطمئن نہیں ہے تو اُس کو اپنے موجودہ کام پر باقی رہتے ہوئے نیا کام ڈھونڈھنا چاہئے۔ اُس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ دوسرا بہتر کام حاصل کیے بغیر وہ اپنے پہلے کام کو چھوڑ دے۔ اس کو چاہئے کہ وہ ناپسندیدگی کے باوجود اس وقت تک اپنے پہلے کام پر قائم رہے جب تک کہ اُس کو دوسرا زیادہ بہتر کام نہ مل جائے۔

با مقصد انسان کا کردار

صہیب بن سنان الرومی اُن اصحابِ رسول میں سے ہیں جنہوں نے دور اوّل میں اسلام قبول کیا۔ اُن کی پیدائش موصل میں ہوئی۔ اُنہوں نے مدینہ میں ۳۸ھ میں وفات پائی۔ بوقت وفات اُن کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ اُن سے تین سوسات حدیثیں مروی ہیں۔ اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أنا سابق العرب، وصهيب سابق الروم**۔

صہیب رومی کا تذکرہ تاریخ اسلام کی اکثر کتابوں میں آیا ہے۔ مثلاً طبقات ابن سعد، تاریخ ابن عساکر، وغیرہ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صہیب رومی ایک اونچے خاندان کے فرد تھے۔ پھر وہ مکہ میں تجارت کرنے لگے۔ انہوں نے تجارت میں کافی دولت کمائی (**كان صهيب قد ربح مالا وفيرا من تجارته**)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ کے لیے ہجرت فرمائی تو صہیب رومی نے بھی ہجرت کا فیصلہ کیا۔ روایات بتاتی ہیں کہ اُن کی ہجرت کی خبر لوگوں کو ہوگئی۔ چنانچہ قریش کے کچھ نوجوان اُن کے پاس آئے۔ اُنہوں نے کہا کہ تم نے اپنا یہ مال مکہ میں حاصل کیا ہے۔ اس کو لے کر ہم تم کو مدینہ نہیں جانے دیں گے۔ صہیب رومی نے کہا کہ اگر میں تم کو اپنا مال دے دوں تو کیا تم مجھ کو جانے دو گے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد صہیب رومی نے اپنا سارا مال اُن کے حوالہ کر دیا (**فجعل لهم ماله أجمع**)

اپنا مال قریش کے حوالہ کر کے صہیب رومی مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ مدینہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کو مکہ کا پورا واقعہ بتایا۔ اُس کو سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **يا أبا يحيى ربح البيع** (اے ابویحییٰ، تمہاری تجارت کامیاب رہی) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: **ربح صهيب، ربح صهيب** (صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی)۔

البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔

حضرت صہیب رومی کا یہ واقعہ جس کی تصدیق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، بے حد اہم ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بامقصد انسان کا کردار کیا ہونا چاہئے۔ اس کا کردار یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مقصد کے علاوہ ہر دوسری چیز کو ثانوی (سیکنڈری) درجہ پر رکھے۔ وہ اپنے مقصد کو بچانے کی خاطر ہر دوسری چیز کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔

مذکورہ واقعہ پر غور کیجئے۔ حضرت صہیب رومی کے سامنے ایک صورت یہ تھی کہ وہ یہ سوچیں کہ یہ مال میں نے اپنی محنت سے کمایا ہے۔ وہ میرا ایک جائز حق ہے۔ مجھے اپنے حق سے محرومی کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے ہر حال میں اپنے مال کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہئے، خواہ اُس کے لیے مجھے ظالموں سے لڑائی لڑنی پڑے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ یہ سوچیں کہ مدینہ دعوتِ اسلامی کا مرکز بن رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر مجھے اس دعوتی مہم میں شریک ہونا ہے۔ اسلام کے اس قافلہ کے ساتھ مل کر مجھے چاہئے کہ میں اس تاریخی مہم کو اُس کی تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کروں۔

صہیب رومی نے محسوس کیا کہ یہ کم بہتر اور زیادہ بہتر کے درمیان انتخاب کا معاملہ ہے۔ اگر میں مال کے لیے ٹکراؤ کروں تو یہ کوئی عقل مندی نہ ہوگی۔ یہ مال کی خاطر مقصد کو قربان کرنے کے ہم معنٰی ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے مقصد کو بچانے کی خاطر مال کو قربان کر دیا اور اُس سے دست بردار ہو کر مدینہ چلے گئے۔

اس طرح کے معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے منطقی انصاف کا طریقہ، اور دوسرا ہے عملی حل کا طریقہ۔ منطقی انصاف کا مطلب یہ ہے کہ خالص فنّی اعتبار سے صحیح اور غلط کو معلوم کیا جائے، جیسا کہ قانونی عدالت میں ہوتا ہے۔ اور دوسرا ہے عملی حل (practical solution)۔ عملی حل کا مطلب یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے صحیح اور غلط کی بحث میں نہ پڑا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ عملی حالات کے اعتبار سے مسئلہ کا مثبت حل کیا ہے۔ پہلا طریقہ عام انسان کا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ بامقصد انسان کا طریقہ۔

عام انسان کو صرف یہ معلوم رہتا ہے کہ قانون کے مطابق، اُس کا حق کیا ہے۔ اس کے برعکس

بامقصد انسان قانونی حق اور منطقی انصاف سے بلند ہو کر یہ سوچتا ہے کہ میرے لیے اپنے مقصد اعلیٰ کو حاصل کرنے کا مفید طریقہ کیا ہے۔ سوچ میں اس فرق کی بنا پر، عام انسان لوگوں کے ساتھ زر اور زمین کا جھگڑا کرتا رہتا ہے، کیونکہ اس کے سوا اُس کا اور کوئی نشانۂ حیات نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بامقصد انسان کا نظریہ، حضرت مسیح کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ، کوئی تمہارا کرتا لینا چاہے تو اُس کو اپنا چُغہ بھی دے دو۔ یعنی دنیوی چیزوں کے معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو فوراً یک طرفہ قربانی کے ذریعہ اُس نزاع کو ختم کردو، تاکہ مقصد کی طرف تمہارا سفر کسی خلل کے بغیر مسلسل طور پر جاری رہے۔

اس طرح کے نزاعی معاملات میں عام انسان کا قول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنا حق کیوں چھوڑیں، ہم انصاف سے دست بردار کیوں ہوں۔ مگر بامقصد انسان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ دنیوی حق کو لینے کی کوشش میں وہ ربانی حق سے محروم ہو جائے گا۔ دنیوی انصاف کو حاصل کرنے کی لڑائی میں وہ آخرت کے انصاف کی میزان میں اپنے آپ کو بے قیمت کرلے گا۔ سوچنے کا یہی فرق دونوں کے عمل میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ ایک، دنیا کی خاطر آخرت کو گنوا دیتا ہے، اور دوسرا، آخرت کی خاطر دنیا کو۔

حقیقت پسندی

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کا ایک قول ہے: لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین (العبقریات الاسلامیة، ص ۵۰۵) یعنی دانش مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ بلکہ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے بہتر شر کون سا ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اور دوسرے فرد یا ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاملہ کو طے کرنے کی صورت کیا ہو۔ وہ کون سا رہنما اصول ہے جس کی روشنی میں باہمی نزاعات کو طے کیا جائے۔

ایسے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے میں شر نہ آئے بلکہ خیر آئے۔ وہ اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائیں اور جو انصاف ہے اس کو حاصل کریں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ ساری کوشش کے باوجود آخر میں انھیں شکایت اور نقصان کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں کوئی بھی شخص اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح کے معاملہ میں ہر نزاع کے دو فریق ہوتے ہیں۔ کسی بھی فیصلہ کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک فریق کے ساتھ دوسرا فریق بھی اس پر راضی ہو۔ ایک فریق جس چیز کو خیر یا انصاف سمجھتا ہو، اگر دوسرا فریق اس کو تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو تو اس کا نتیجہ دو طرفہ ٹکراؤ ہوگا۔ اور ٹکراؤ ہمیشہ مسئلہ کو بڑھانے والا ہوتا ہے نہ کہ اس کو گھٹانے والا۔

ایسی حالت میں دانش مندی کا تقاضا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے انصافی کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کو ممکن اور ناممکن کی نظر سے دیکھا جائے۔ پھر جو چیز عملی طور پر ممکن ہے اس کو لیا جائے اور جو چیز عملی طور پر ناممکن ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

اس معاملہ کی ایک تاریخی مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کے مسئلہ پر نزاع پیدا ہوئی جو اس کے بعد پچاس برس تک چلتی رہی۔ یہودیوں کا یہ کہنا تھا کہ دو فریقوں کے درمیان امن کا معاہدہ ہو جائے۔ لیکن عرب اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ امن صرف عدل کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، عدل نہیں تو امن بھی نہیں۔ مگر بے شمار قربانیوں کے باوجود عربوں کا یہ نظریہ فیل ہو گیا اور بیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے عدل کی شرط کو پس پشت ڈال کر صرف امن کے مقصد کے تحت اسرائیل سے معاہدہ کر لیا۔

نظری طور پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جب دو فریقوں میں نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو ان کے درمیان امن کا قیام عدل کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ آئیڈیلزم کے اعتبار سے یہ نظریہ بہت اچھا ہے مگر عملی اسباب بتاتے ہیں کہ اس قسم کا آئیڈیل کبھی قابلِ حصول نہیں ہوتا۔ اس طرح کے نزاعی معاملات میں دانش مندی یہ ہے کہ آدمی نظری انصاف پر اصرار نہ کرے بلکہ عملی انصاف پر راضی ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ امن اور انصاف کو ایک دوسرے کے ساتھ بریکٹ کرنا بجائے خود غلط ہے۔ اس دنیا میں امن انصاف کے لیے نہیں ہوتا۔ امن کا تعلق مواقع کار سے ہے، نہ کہ عدل و انصاف سے۔ امن اس لیے حاصل نہیں کیا جاتا کہ اس کے ساتھ انصاف حاصل ہو جائے۔ بلکہ امن اس لیے قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ مواقع کار حاصل ہوں جن کو استعمال کر کے عدل و انصاف تک پہنچا جا سکے۔

مثال کے طور پر ۱۹۴۸ میں فلسطین کی جو صورتحال تھی اس میں عربوں کو فلسطین کا بیشتر حصہ ملا ہوا تھا۔ اس وقت دانش مندانہ پالیسی یہ تھی کہ اس صورتحال کو قبول کر کے یہودیوں سے وہ صلح کر لی

جائے جو پچاس برس بعد کی گئی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کا زبردست فائدہ ہوتا۔ اس طرح عربوں کے لیے ممکن تھا کہ وہ امن قائم کر کے اپنے تعمیر واستحکام کی جدوجہد شروع کردیں۔ پچھلے پچاس برس میں انھوں نے انصاف کے حصول کے نام پر بے شمار دولت ضائع کی ہے۔ اور لاکھوں قیمتی جانوں کا نقصان کیا ہے۔ قیام امن کی صورت میں ان کا یہ تمام سرمایہ تعمیر واستحکام کے محاذ پر لگ جاتا۔ اس مثبت پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ان تمام چیزوں کو لڑائی کے بغیر کامیاب طور پر حاصل کر لیتے جس کو وہ لڑائی کے ذریعہ ناکام طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس معاملہ کی بہترین مثال اسلام کے دور اول کا وہ تاریخی واقعہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرک قبائل کے درمیان زبردست نزاع تھی۔ ان مشرکین نے آپ کو آپ کے وطن مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں کے خلاف دوسری بہت سی ناانصافیاں کر رہے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اگر امن کے حصول کے لئے عدل کی شرط لگاتے تو دونوں فریقوں کے درمیان کبھی امن قائم نہ ہوتا۔ مگر آپ نے یہ کیا کہ عدل وانصاف کے سوال کو الگ کر کے مشرکین سے گویا ''امن برائے امن'' کے اصول پر صلح کرلی۔ اس امن کو آپ نے کام کے ایک موقع کے طور پر لیا۔ اور اس کو اسلام کی تعمیر واستحکام کے لیے استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے اندر مزید اضافہ کے ساتھ وہ سب کچھ حاصل ہوگیا جس کو آپ نے بظاہر معاہدہ امن کے وقت کھو دیا تھا۔

دانش مندی کا یہ اصول جس طرح اجتماعی نزاعات کے لیے ہے، اسی طرح وہ انفرادی نزاعات واختلافات کے لیے بھی ہے۔ انفرادی معاملات میں بھی کامیابی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خیر اور شر یا صحیح اور غلط کی بنیاد پر معاملات کو طے کرنے کے بجائے ممکن اور ناممکن کی بنیاد پر ان کو طے کیا جائے۔

گھر کے اندر دو مردوں یا دو عورتوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو یہ نہیں دیکھنا چاہئے

کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ عملی حالات کے اعتبار سے ممکن کیا ہے اور ناممکن کیا ہے۔ حق اور ناحق یا صحیح اور غلط کی بحث میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اختلاف کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آپ ممکن پر راضی ہو جائیں تو بیک وقت آپ کو دو فائدے حاصل ہوں گے ـــــ اختلاف کا فوری خاتمہ اور مواقعِ کار کا حصول۔

یہی اصول تمام انفرادی نزاعات کے لیے ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں کے درمیان ہر شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مالی اور کبھی غیر مالی۔ ایسے مواقع پر جو شخص حق اور باطل یا صحیح اور غلط کی بحث چھیڑے وہ بلاشبہہ غیر دانش مند انسان ہے۔ اس کے بجائے جو عملی تقاضوں کو سمجھے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے ممکن پر راضی ہو جائے تو ایسا ہی شخص عقل مند ہے، اور یہی وہ شخص ہے جو اس دنیا میں کامیابی حاصل کرے گا۔

اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو لوگوں کی توجہ تمام تر اس پر لگ جاتی ہے کہ ازروئے انصاف کیا ہونا چاہئے یا ان کے نزدیک اس معاملہ میں حق کیا ہے اور پھر اس حق کے حصول کے لئے فریق ثانی سے لڑائی چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ لڑائی اکثر سالہا سال تک جاری رہتی ہے اور اکثر کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچتی۔ اس طرح کے موقع پر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ مفروضہ حق کے حصول میں جو وقت اور طاقت خرچ ہوگی اس کو مقابلہ آرائی سے بچا کر اپنی مثبت تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

ٹکراؤ ہمیشہ حق کے حصول کے نام پر کیا جاتا ہے۔ مگر عملی طور پر ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے دوران نہایت قیمتی مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں عقلمندی یہ ہے کہ ہر معاملہ میں یہاں عملی نقطہ نظر اختیار کیا جائے۔ ایک شخص اپنی ذاتی زندگی میں آئیڈیل کو اپنا نشانہ بنا سکتا ہے، مگر جب اجتماعی زندگی کا معاملہ ہو تو اس کو ہمیشہ پریکٹکل بن جانا چاہئے۔

عبرت پذیری

ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء (جلد ۱) میں محمد بن واسع سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص بصرہ سے سوار ہوکر امّ ذر کے پاس آیا جب کہ ان کے شوہر ابوذر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے ام ذر سے پوچھا کہ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے حضرت ابوذر کی عبادت کے بارہ میں بتائیں۔ صحابی کی اہلیہ ام ذر نے جواب دیا: وہ سارے دن اکیلے بیٹھے ہوئے سوچتے رہتے تھے (**کان النهار اجمع خالیاً یتفکر**) اسی طرح ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء (جلد ۱) میں عون بن عبداللہ بن عقبہ سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے ام الدرداء سے پوچھا کہ حضرت ابوالدرداء کا سب سے افضل عمل کیا ہوتا تھا۔ ان کی اہلیہ نے جواب دیا: سوچنا اور عبرت پکڑنا (**التفکر والاعتبار**) سالم بن ابی جعد کہتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء کے سامنے سے دو بیل گزرے۔ دونوں کو ان کے مالک نے کام پر لگا رکھا تھا۔ ایک بیل اپنے کام پر قائم رہا اور دوسرا رک گیا۔ حضرت ابوالدرداء نے یہ منظر دیکھ کر کہا: اس میں بھی عبرت ہے (**ان فی هذا لمعتبراً**) یعنی رکنے والے نے مالک کا ڈنڈا کھایا اور دوسرے نے نہیں، یہی معاملہ انسان کے ساتھ اس کا خدا کرے گا۔

قرآن میں غور و فکر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ غور و فکر مومن کی مستقل صفت ہے۔ اسی سے آدمی کے اوپر معرفت خداوندی کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی سے وہ اس درجۂ احسان تک پہنچتا ہے جس کے متعلق حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو (**تعبد الله کانک تراه**)

قرآن میں اہل ایمان کی ایک صفت **السائحون** (زمین پر پھرنے والے) بتائی گئی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ سیاحت کا لفظ قدیم زمانہ سے مذہبی سفر کے لئے بولا جاتا رہا ہے۔ لسان العرب میں اس کی تشریح کے ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں: **الذهاب فی الارض للعبادة والترهب** (عبادت اور دنیا سے بے تعلقی کے لئے زمین میں نکل جانا) مفردات امام راغب میں ہے کہ ایک قول

کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس آیت قرآنی کے تقاضوں پر چلیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں جس سے ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ اس سے سمجھتے اور ان کے کان ایسے ہو جاتے جن سے وہ سنتے (قیل السائحون هم الذین یتحرّون ما اقتضاه قوله: افلم یسیروا فی الارض فتكون لهم قلوب یعقلون بها او آذان یسمعون بها، (الحج ۴۶) بعض مفسرین کے نزدیک السائحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی توحید اور اس کے نظام تخلیق میں بہت زیادہ فکر کریں اور اللہ نے جو عبرت اور نشانیاں اپنی توحید اور عظمت کو بتانے والی پیدا کی ہیں ان پر غور کریں (وقیل هم الجاهدون بافكار هم فی توحیدربهم و ملكوته و ماخلق من العبر و العلامات الدالة علی توحیده وتعظیمه)

انسان کے بنائے ہوئے تمدن کے ماورا جو خدا کی دنیا ہے وہ خدا کی صفات کمال کا براہ راست مظہر ہے۔ یہاں مخلوقات میں اس کا خالق دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اس تخلیقی کارخانہ میں خدا نے ایسی نشانیاں رکھ دی ہیں جو سوچنے والے کی آنکھیں کھول دیں۔ جو اس کے اندر ربانی شعور بیدار کریں، جو اس کو تڑپا کر اس کے رب سے ملا دینے کا سبب بن جائیں۔

آدمی کا عمل اس کی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ سوچ گہری ہوگی اتنا ہی زیادہ گہرا نتیجہ نکلے گا اور سوچ میں جتنی کمی ہوگی اتنا ہی عمل میں کمی ہو جائے گی۔

اسلام کی بنیاد شعور پر قائم ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے شعور کو زیادہ سے زیادہ بیدار کیا جائے۔ انسان کی فکری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ انسانی دماغ کے سوئے ہوئے خانوں کو آخری حد تک متحرک کر دیا جائے۔

اسی شعوری بیداری پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ باشعور لوگ ہی اعلیٰ ایمان کا تجربہ کرتے ہیں۔ باشعور لوگوں کی عبادت ہی زندہ عبادت ہوتی ہے۔ باشعور لوگ ہی یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں ربانی کردار کا نمونہ بنیں۔ باشعور افراد کے مجموعہ کا نام ہی صالح معاشرہ ہے۔ باشعور افراد ہی یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ اسلام کے اصولوں پر ایک حقیقی نظام بنائیں۔

حضرت لبیدؓ

لبید بن ربیعہ بن مالک العامری (وفات ۴۱ھ) قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں سے ہوتا ہے۔ ہجرت کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انہوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کہا جاتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد انہوں نے صرف ایک شعر کہا تھا جو یہ ہے:

ماعاتب المرء الكريم كنفسه والمرء يصلحه الجليس الصالح

عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک بار حضرت لبیدؓ سے کہا کہ اپنے کچھ اشعار سنائیے۔ حضرت لبید نے جواب دیا کہ اللہ نے جب مجھ کو بقرہ اور آل عمران جیسی سورتوں کی تعلیم دی تو اس کے بعد میرے لیے مناسب نہیں کہ میں شعر کہوں (**ماكنت لأقول شعراً بعد أن علمني الله البقرة و آل عمران**) ابن عبدالبر، الاستیعاب۔

حضرت لبید نے اپنے شعر میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ شریف آدمی احتساب غیر کے بجائے احتساب خویش کے معاملہ میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی غلطی پر گرفت کرتے ہوئے نرمی کا انداز اختیار کرسکتا ہے مگر جب معاملہ خود اپنی غلطی کا ہو تو وہ اس کے لیے بے رحم محاسب بن جاتا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرع میں انہوں نے صحبت کی اہمیت بتائی ہے۔ آدمی اگر زیادہ دیر تک برے شخص کی صحبت اختیار کرے تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی برا بن جائے اور جب آدمی اچھے انسان کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس کی صحبت کے اثر سے وہ بھی ایک اچھا آدمی بن جاتا ہے۔

یہ بات بظاہر قرآن کے مقابلہ میں ہے مگر وسیع تر معنی میں اس کا تعلق دوسری حقیقتوں سے بھی ہے۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے اس کا تعلق قرآن کے سامنے خاموشی اختیار کرنے سے ہے۔ اور وسیع تر انطباق کے لحاظ سے ہر حق کے سامنے اپنی زبان بند کر لینے سے۔

شریف، کمینہ

قال العتبی سمعت اعرابیا یقول: اسوأ ما فی الکریم ان یکف عنک خیرہ و خیر مافی اللئیم ان یکف عنک شرہ (الامالی للقالی)

عتبی کا قول ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ شریف آدمی کے لئے سب سے بری چیز یہ ہے کہ وہ اپنا خیر تم سے روک دے اور کمینہ آدمی کے لئے سب سے بہتر چیز یہ ہے کہ وہ اپنے شر سے تم کو بچائے۔

شریف آدمی وہ ہے جو دوسروں کے لئے نفع بخش ہو۔ جو بولے تو انصاف اور خیر خواہی کی بات بولے۔ اس کے مال اور اس کے اثاثہ میں دوسروں کا حصہ ہو۔ وہ صرف اپنے لئے نہ جئے بلکہ یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اس کے اوپر دوسروں کا بھی حق ہے۔

جو شخص شریف ہو یا لوگوں کی نظر میں شریف سمجھا جائے، اس کے لئے یہ بات اس کی شرافت کے خلاف ہوگی کہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنا بند ہو جائے۔ یہ بات اس کے لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے ہم معنی ہے کہ اس کا قول اور اس کا عمل دوسروں کے لئے اپنی افادیت کھودے۔

اس کے برعکس کمینہ آدمی وہ ہے جس کے اندر نفع بخشی کی صلاحیت نہ رہے۔ اس کی زبان لوگوں کی برائی میں کھلے۔ وہ بولے تو بے انصافی اور بدخواہی کی بات بولے۔ وہ صرف لینا جانتا ہو، اس کے یہاں دینے کا کوئی خانہ نہ ہو۔ وہ اپنی ذات کے لئے جی رہا ہو۔ دوسروں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ایسا آدمی دوسروں کے لئے سراپا شر ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا آخری احسان یہ ہے کہ وہ اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ رکھے۔ اس کی کثافت اس کی اپنی ذات تک محدود رہے۔ اس کی کثافت دوسروں تک نہ پہنچنے پائے۔

شریف آدمی خدا کے باغ کا پھول ہے اور کمینہ آدمی خدا کے باغ کا کانٹا۔ شریف آدمی سے لوگوں کو مہک ملتی ہے اور کمینہ آدمی سے صرف تلخی اور اذیت۔

یکطرفہ حسن سلوک

احنف بن قیس تابعی کا واقعہ ہے۔ ایک دن وہ بازار گئے اور اپنی ضرورت کا سامان لے کر اپنے گھر واپس جانے لگے۔ راستہ میں ان کو ایک آدمی ملا جوان سے بغض رکھتا تھا۔ وہ ان کو برا بھلا کہنے لگا۔ احنف بن قیس خاموشی کے ساتھ اس کو سنتے ہوئے اپنا راستہ چلتے رہے۔ وہ آدمی بھی ان کے ساتھ چلتا رہا اور مسلسل ان کو گالیاں دیتا رہا۔

آخر کار ایک جگہ پہنچ کر احنف بن قیس رک گئے۔ اب وہ اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ میں یہاں کھڑا ہوں۔ تم کو اور جو کچھ میرے خلاف کہنا ہے اسے کہہ لو۔ کیوں کہ اب میرا محلہ قریب آگیا ہے۔ یہاں لوگ میری عزت کرتے ہیں اور مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ مجھ کو ڈر ہے کہ ان کے سامنے اگر تم نے مجھ کو برا کہا تو وہ برداشت نہیں کریں گے اور ضرور تم کو تکلیف دیں گے۔ (**قل ماعندك، فأنه قد دنا الحی واهله يُؤقروننی، و إنی لاخشی أن يُؤذوك إذا سمعوك تسببنی**)

یہ ایک عظیم انسانی صفت ہے جو مذکورہ واقعہ میں ملتی ہے۔ احنف بن قیس تابعی کو یہ پریشانی نہیں ہوئی کہ ایک شخص انہیں بُرا کہہ رہا ہے۔ اس کے بجائے وہ یہ سوچ کر پریشان ہوئے کہ ان کے محلے والے اگر اس بات کو جان لیں گے تو وہ مذکورہ شخص کو تکلیف پہنچائیں گے۔

یہی بات مزید اضافہ کے ساتھ داعی کے اندر پائی جاتی ہے۔ داعی کو جب اس کا مدعو گروہ ستاتا ہے اور اس پر ظلم کرتا ہے تو وہ اپنی مظلومیت سے زیادہ اس بات کے لیے فکرمند ہو جاتا ہے کہ مدعو گروہ اپنی اس بے راہ روی کی بنا پر خدا کی پکڑ میں نہ آجائے۔

یہ احساس داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مدعو کے خلاف بددعا کرنے کے بجائے اس کے حق میں دعا کرے۔ وہ اس سے انتقام لینے کے بجائے اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے۔ وہ اس کے غلط سلوک کو دیکھ کر اس کے ساتھ اور بھی زیادہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے۔ لوگوں کے ساتھ یکطرفہ شفقت کا معاملہ کرنا، ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے اور یہ اعلیٰ انسانی صفت داعی کے اندر آخری حد تک پائی جاتی ہے۔

صحیح طرز فکر

میں نے تقریباً ہر موضوع کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس مطالعہ کے دوران میں اُس موضوع تک پہنچا جس کو آرٹ آف تھنکنگ (art of thinking) کہا جاتا ہے۔ اس پر میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ عمل تفکیر (thinking process) کو درست طور پر چلانے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ سوچنے کا درست طریقہ کیا ہے۔ ورنہ برسوں کی ذہنی کاوش کے باوجود وہ صرف کنفیوزن (confusion) میں مبتلا رہے گا۔ اگر چہ اپنے خیال کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ میں سوچنے کا عمل کر رہا ہوں۔ کسی معاملہ میں صحیح نقطہ نظر تک پہنچنے کی یہ سب سے زیادہ ضروری شرط ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ آدمی کو یہ جاننا چاہئے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے بلکہ کسی اور نے اس کو اپنے نقشہ کے مطابق بنایا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق یہ بنانے والا خدا ہے۔ اور خدا نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ علم ایک کثیر خزانہ ہے، جس کا صرف قلیل حصہ انسان کو دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

لمبی مدت کے تجربہ کے بعد جدید سائنس نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

یہاں میں ایک متقابل مثال دوں گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ۵ ہزار سال کی مسلسل کوشش کے باوجود فلسفہ کا کوئی حاصل (achievement) نہیں۔ اس کے برعکس سائنس نے دنیا کو بہت زیادہ چیزیں دی ہیں۔ اس فرق کی واحد وجہ یہ ہے کہ فلسفہ نے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا کہ وہ صرف جزئی علم تک پہنچ سکتا ہے، اس کو جزئی علم پر قناعت کرتے ہوئے کلی رائے قائم کرنا ہے۔ اس کے برعکس سائنس نے علمی قناعت کا یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ اسی کا نتیجہ وہ تمام مادی ترقیاں ہیں جو موجودہ زمانہ میں سائنس کے ذریعہ انسان کو ملیں۔

فلسفہ اور سائنس کے اس فرق کو بطور علامت لیتے ہوئے میں کہوں گا کہ جو آدمی اپنے تھنکنگ پراسس (thinking process) کو کامیابی کے ساتھ منزل تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ ''فلاسفر'' نہ بنے بلکہ وہ ''سائنٹسٹ'' بنے۔ یعنی فطرت کے نظام کے مطابق، وہ جن باتوں کو جان سکتا ہے ان کو وہ جاننے کی کوشش کرے۔ اور جن باتوں کو وہ اپنی محدودیت کی بنا پر نہیں جان سکتا ان کے بارے میں وہ اجمالی علم پر قناعت کرے۔ اسی حقیقت کو ایک عالم نے ان الفاظ میں بیان کیا: **ابھموا ما ابھمہ اللہ** (جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا تم بھی اس کو مبہم رکھو)

علم کے دو پہلوؤں میں فرق کے اصول کو ملحوظ رکھنے کی یہی واحد تدبیر ہے جو آدمی کو کنفیوزن (confusion) سے بچا سکتی ہے جو کہ صحیح نتیجہ فکر تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو جانے کہ کنفیوزن کیا ہے اور رائٹ تھنکنگ (right thinking) کیا، اس نے گویا وہ چیز پالی جو موجودہ دنیا میں علم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صحیح رائے تک پہنچنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ظاہر (appearance) اور حقیقت (reality) میں فرق کرے۔ وہ صرف گہرے تجزیہ کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرے۔ اس کی ایک مثال کچھ لوگوں کی وہ بات ہے جو اکثر نقل کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ قرآن کو ڈسکریڈٹ کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ قرآن ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں اترا جب کہ لوگ سادہ قسم کی فطری زندگی گزارتے تھے۔ اب بڑی بڑی ترقیاں ہو چکی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ انسان کے لئے قدیم قرآن میں اپیل نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک سطحی بات ہے۔ آج جو ترقی ہوئی ہے وہ تمام ترٹکنکل ترقی ہے اور قرآن کا خطاب انسانی فکر سے ہے نہ کہ فنی ترقیات سے۔ جہاں تک انسانی ذہن کے لیول کا تعلق ہے وہ آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ نفسیاتی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے یونان کے فلسفیوں کا جو درجہ فکر تھا وہ عین وہی تھا جو آج کے انسان کا درجہ فکر ہے۔ اس اعتبار سے آج کے انسان اور ماضی کے انسان میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن ایک نظریاتی کتاب ہے۔ اس کا خطاب فطرت انسانی سے ہے۔ قرآن کے پیغام کو سمجھنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ذہنی استعداد (intellectual competence) ہے نہ کہ فنی استعداد (technical competence)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا انسان جس طرح قرآن کا مخاطب بن سکتا تھا، ٹھیک اسی طرح آج کا انسان بھی قرآن کا مخاطب بن سکتا ہے۔ کیوں کہ دونوں کے معیار ذہنی میں کوئی فرق نہیں۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کی جو فکری سطح ہے، کسی کمی کے بغیر وہی فکری سطح پیغمبر کے زمانہ کے لوگوں کی بھی تھی۔ مثلاً دور جدید کے ایک مغربی مفکر ولیم رالف انگ (William Ralph Eng) کا قول ہے جو گویا آج کے ایک تعلیم یافتہ انسان کی ذہنی سطح کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نے کہا:

The wise man is he who knows the relative value of things.

ٹھیک یہی بات ایک صحابیٔ رسول حضرت عمر فاروق نے اپنے الفاظ میں اس طرح کہی: **لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین** ۔ (عقل مند وہ نہیں جو خیر کو اور شر کو جانے بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کمتر شر (lesser evil) کون سا ہے۔ یہ دونوں مثالیں بتاتی ہیں کہ معیار ذہن کے اعتبار سے آج کے انسان اور ساتویں صدی کے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ پھر جو قرآن ساتویں صدی کے انسان کو اپیل کرسکتا تھا وہ موجودہ زمانہ کے انسان کو کیوں اپیل نہیں کرے گا۔

آخری بات یہ کہ فکرِ صحیح کی کلید یہ ہے کہ آدمی منتشر ذہن اور درست ذہن کے فرق کو جان لے:

To know the difference between a sound mind
and confused mind is key to right thinking.

ڈی کنڈیشننگ

پیاز کے اوپر ایک کے بعد ایک پرت ہوتی ہے۔ اگر ان پرتوں کو ہٹائیں تو ہٹاتے ہٹاتے اس کا آخری حصہ آجائے گا جو پیاز کا داخلی مغز ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرت صحیح پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد ماحول کے اثر سے اس کے اوپر خارجی افکار چھانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کی داخلی فطری شخصیت بالکل ڈھک جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر آدمی متعصبانہ طرز فکر کا کیس بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی اپنی ساری عمر انہی تعصّبات کے تحت سوچتا رہتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ **من شبّ علی شیء شاب علیه** (آدمی جس چیز پر جوان ہوتا ہے اسی پر وہ بوڑھا ہوتا ہے)

یہ صورت حال ہر آدمی کو مطابق واقعہ سوچ (as it is thinking) سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کا علاج صرف ایک ہے۔ ہر آدمی پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد گہرائی کے ساتھ اپنا جائزہ لے۔ وہ اپنی کنڈیشننگ کی دوبارہ ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنی شخصیت پر چڑھی ہوئی اوپری پرتوں کو ہٹائے، یہاں تک کہ اس کی اصل فکری شخصیت اس طرح کھل جائے کہ وہ تعصبات سے پاک ہو کر سوچنے لگے۔ یہ اپنی مصنوعی شخصیت کو دوبارہ حقیقی شخصیت بنانے کا عمل ہے جو ہر شخص کی ایک لازمی ضرورت ہے۔

اپنی کنڈیشننگ کی ڈی کنڈیشننگ کرنے کا یہ عمل بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں آدمی کو خود اپنے خلاف ایک ذہنی محنت (intellectual labour) کرنا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو اپنی مانوس اور محبوب سوچ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو خود اپنے آپ پر بلڈوزر چلانا پڑتا ہے۔ تاہم یہی واحد عمل ہے جو آدمی کو متعصّبانہ یا غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر سے پاک کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ عمل گویا اپنا فکری آپریشن کرنے کا عمل ہے۔ یہ بلا شبہہ ایک مشکل ترین کام ہے۔ مگر اس کام کے بغیر کوئی بھی شخص بے آمیز سوچ کا مالک نہیں بن سکتا۔ اس معاملہ میں کوئی بھی دوسری چیز فکری تطہیر کا بدل نہیں۔

اسلوب تنقید

مولانا انیس لقمان ندوی نے بتایا کہ ۲۲ جون، ۱۹۹۸ کو ابوظبی میں ڈاکٹر عزالدین ابراھیم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دوران ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ابتداء ہی میں میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھ سے صرف فصیح عربی میں بات کریں۔ کیوں کہ میں فصیح عربی کے معاملہ میں اس سے زیادہ غیور ہوں جتنا غیور کوئی مرد اپنی بیوی کے معاملہ میں ہوتا ہے اور یہ کہ اگر آپ مجھے فصحیٰ میں گالی دیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ آپ عامی زبان میں میری تعریف کریں (**كلّمني من فضلك بالعربية الفصحى، فاني والله أغار على اللغة العربية الفصحى أكثر مما يغار الرجل على زوجته. ولو شتمتني بالفصحىٰ، فانه أحب إلى من أن تمدحني بالعامية**) یہ سن کر وہ بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ بات آپ نے اتنے خوب صورت پیرایہ میں کہی ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ ضرب المثل بن جائے (**إن كلامك هذا مصوغ صياغة رائعة لدرجة أنه ليكاد أن يكون مضرب المثل**)

مولانا انیس لقمان ندوی نے مذکورہ عرب سے جو بات کہی وہ عربوں کے لیے ایک سخت تنقید کی حیثیت رکھتی تھی کیوں کہ عرب دنیا میں علماء تک کا یہ حال ہے کہ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو غیر فصیح زبان بولنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ مصر میں یہ حال ہے کہ فصیح زبان میں گفتگو کرنا ادبی اعتبار سے غیر معیاری ہے۔ ایسے آدمی کو دیہاتی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ غیر فصیح زبان بولنے کا رواج شہروں میں ہے نہ کہ دیہات میں۔

مگر اس کھلی تنقید کو انہوں نے برا نہیں مانا۔ اس کی وجہ تنقید نہیں ہے بلکہ تنقید کا اسلوب ہے۔ ناقد نے اگر چہ ایک تنقیدی بات کہی تھی لیکن اس کے لئے انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا جو نہ صرف غیر جارحانہ تھا بلکہ اس میں عربی زبان کا ایک اعتراف بھی تھا۔ اس میں ایک عرب کے لئے اس کی پر فخر نفسیات کی تسکین موجود تھی۔

استعداد کا مسئلہ

اردن سے ایک عربی میگزین ''الاجنحۃ'' کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۱۹۹۰ (صفحہ ۵۸) میں ایک عرب خاتون لیما نبیل کا ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا: غرناطۃ ـــــ الفردوس المفقود۔ (غرناطہ، فردوس گمشدہ)

موصوفہ سیاح کے طور پر غرناطہ گئیں۔ وہاں انہوں نے عرب عہد کے آثار کو دیکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ غرناطہ میں میں نے عرب تاریخ کو اپنے سامنے پایا اور اپنے ماضی کی عظمت کا مشاہدہ کیا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ وہ وہاں کے ایک ایک پتھر سے پوچھتی رہیں کہ یہاں عرب کی عظمت تھی اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی (ھنا کان المجد العربی وھنا ایضا بدأالذل العربی قبل خسمائۃ عام)''۔

وہ جذباتی انداز میں لکھتی ہیں کہ عربوں نے یہاں اپنے قلعوں اور محلوں اور مسجدوں کو چھوڑ دیا'' وہ اس شہر سے عورتوں کی طرح روتے ہوئے نکلے۔ وہ مردوں کی طرح اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ (ترکوا قلاعھم و قصورھم و مساجدھم۔ خرجوا من ھذہ المدینۃ یبکون مثل النساء۔ ملکا لم یحافظوا علیہ مثل الرجال۔ وخرجتُ من غرناطۃ اطاطئی راسی و اسأل نفسی ۔ الی متی سیستمر ھذا اللیل العربی۔ وماذا سیکتب التاریخ ھنا)

عرب خاتون نے اپنے اس تاثراتی جملہ میں غرناطہ کے آخری سلطان کی ماں کے قول کو دہرایا ہے۔ مگر یہ سادہ معنوں میں مرد اور عورت کا مسئلہ نہیں۔ یہ قومی استعداد کا مسئلہ ہے۔ ۱۷۹۹ میں ٹیپو مرد کی جنگ لڑے مگر وہ ہار گئے۔ ۱۹۷۱ میں اندرا گاندھی ایک عورت تھی مگر وہ پاکستان کے مقابلہ میں جیت گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کا معاملہ نہیں۔ بلکہ قومی استعداد اور حالات کا معاملہ ہے۔ اگر حالات موافقت نہ کر رہے ہوں تو کوئی شخص خواہ کتنی ہی زیادہ بہادری کے ساتھ لڑے، وہ مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

نقصان کی تلافی

ریاض سے ایک عربی ہفت روزہ "الدعوۃ" کے نام سے نکلتا ہے۔ یہ غالباً مسلم دنیا کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت میگزین ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک مضمون چھپا۔ اس کا عنوان تھا:

اجیالنا المسلمة فی الغرب هل نترکها نهبًا للضیاع

یعنی مغربی ملکوں میں ہماری مسلم نسلیں، کیا ہم ان کو لٹ کر ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیں۔

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت مغربی دنیا میں تقریباً دس ملین مسلمان آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روزگار کے لئے یا اور کسی مقصد سے وہاں جا کر مقیم ہو گئے ہیں۔ مضمون نگار (ڈاکٹر عبد القادر طاش) نے ان مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا کہ وہ مغرب میں ہمارے سفیر ہیں (هم سفراؤنا فی الغرب)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح ترین لقب ہے جو مغرب میں مقیم مسلمانوں کو دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ لوگ امکانی طور پر ہمارے سفیر ہیں۔ وہاں وہ ہماری نمائندگی کرنے کی بہترین پوزیشن میں ہیں۔

یہ دس ملین مہاجر مسلمان جو مغربی ملکوں میں جا کر آباد ہوئے ہیں، ان کی اکثریت تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے وہ سادہ معنوں میں صرف مہاجر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مسلم ملت کا بہترین حصہ ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ انہیں اپنی اس حیثیت کا شعور حاصل ہو جائے۔ اور وہ اس عظیم کردار کو ادا کرنے کے لئے مستعد ہو جائیں جو حالات نے ان کے لئے مقدر کیا ہے۔

دس ملین مسلمانوں کا مغربی ملکوں میں جا کر بسنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ گویا اس تاریخ کا نئی صورت میں اعادہ ہے جو اسلام کے دور اول میں پیش آئی تھی۔ دور اول کے مسلمان بہت بڑی تعداد میں تاجر کے روپ میں غیر مسلم ملکوں میں داخل ہوئے ظاہری طور پر ان کا یہ داخلہ تجارت کے لیے، تھا مگر غیر مسلم معاشرہ میں ان کا وجود اپنے آپ اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گیا۔ ٹھیک اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلمان اگر چہ بظاہر اقتصادی اغراض کے تحت مغربی ملکوں میں گئے ہیں مگر اس طرح غیر مسلم سماج میں ان کی موجودگی دوبارہ اسلام کی اشاعت کا سبب بن سکتی ہے، بشرطیکہ ان کے اندر اسلامی دعوت کی اسپرٹ پیدا ہو جائے۔

عالی ظرفی

دور عباسی کا ایک واقعہ تاریخ کی بعض کتابوں میں ان الفاظ میں آیا ہے:

خطب الخلیفة العباسی المنصور یوماً فی جماعة من الاعراب بالشام، فقال: ایھا الناس ینبغی ان تحمدوا الله علی ما وھبکم فیّ۔ فانی منذ ولیتکم ابعد الله عنکم الطاعون الذی کان یفتک بکم۔ فقال له احد المستمعین ان الله اکرم من ان یجمع علینا فی وقت واحد الطاعون والمنصور۔

(خلیفہ منصور عباسی نے ایک روز شام کے اعراب کی ایک جماعت کے سامنے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اے لوگو، تم کو چاہئے کہ تم میرے جیسے خلیفہ کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کیوں کہ جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں اللہ نے تم سے طاعون کو دور کر دیا ہے۔ اس کے بعد سننے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ ایک وقت میں ہمارے اوپر طاعون اور منصور دونوں کو جمع کر دے)۔

اعرابی کا یہ جملہ سخت توہین آمیز تھا۔ عام طریقہ کے مطابق چاہئے تھا کہ خلیفہ منصور عباسی اس کو سن کر بھڑک اٹھے اور مذکورہ شخص کے قتل کا حکم دے دے۔ مگر خلیفہ منصور نہایت بلند حوصلہ آدمی تھا۔ اس نے اس کی قدر کی اور حکم دیا کہ اس شخص کو خزانۂ خاص سے انعام دیا جائے اور اس کو عزت کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا جائے۔

پست اور کمینہ قسم کے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کہنے والے نے ان کی موافقت میں بات کہی ہے یا ان کی مخالفت میں۔ وہ موافق کو نوازتے ہیں اور مخالف کے دشمن بن جاتے ہیں۔ مگر بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگ موافقت اور مخالفت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔ وہ اصل بات کو دیکھتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

اسی کا نام عالی ظرفی ہے۔ یہ عالی ظرفی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر سکے۔ اس کے برعکس جس آدمی کے اندر عالی ظرفی کی یہ صفت نہ پائی جائے۔ اس کو اس کی قیمت اس شکل میں دینی پڑے گی کہ بے صلاحیت افراد کے سوا اس کو کسی اور کی ہم نشینی حاصل نہ ہو۔

قدرتی ڈھال

چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں وحشی تاتاری قبائل کی فوج لے کر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں داخل ہوا اور اس کو تباہ کرڈالا۔ اس کے بعد عرصہ تک وہ لوگ مسلم دنیا کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بناتے رہے۔
امام ابن تیمیہ (۱۲۶۳۔ ۱۳۲۸ء) کا زمانہ وہی ہے جو اس تاتاری فتنہ کا زمانہ ہے۔

دمشق میں ایک بار ابن تیمیہ ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ اس مقام پر تاتاریوں کا ایک گروہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت وہ لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ابن تیمیہ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ ان کے پاس جائیں اور ان کو شراب پینے سے روکیں۔ ابن تیمیہ نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تک یہ لوگ نشہ کی حالت میں رہیں گے، مسلمان ان کی جارحیت سے محفوظ رہیں گے۔ ان کی ہوش کی حالت کے مقابلہ میں ان کی مدہوشی کی حالت زیادہ بہتر ہے (سکرھم خیر من صحوھم)

موجودہ دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کے لئے یہ ایک قیمتی اصول ہے۔ لوگوں کو ان کی دلچسپیوں میں مشغول رہنے دیجئے، آپ ان کے فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

یہ اصول دور جدید کے "تاتاریوں" پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتی دور کے تاتاری اس سے بھی زیادہ بڑے نشے میں مبتلا ہیں۔ یہ دولت کمانے کا نشہ ہے۔ جدید صنعتی انقلاب نے دولت کمانے کے بے حساب نئے مواقع کھول دئے ہیں۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے میں لگائے ہوئے ہے۔ برادرانِ وطن میں یہ کیفیت اور بھی زیادہ ہے۔ کیوں کہ وہ دولت کو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔

ایسی حالت میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ وہ جس "نشہ" میں مشغول ہیں انھیں اسی نشہ میں مشغول رہنے دیا جائے۔ دولت پرستی خود ان پرستاروں کے لئے بری چیز ہے۔ مگر دوسروں کے لئے وہ ان کے مقابلہ میں ایک قدرتی ڈھال بن جاتی ہے۔

باب دوم

داخلی مسئلہ

اخبار کی دو سرخی پڑھئے: ''ملک میں فرقہ واریت کا بڑھتا ہوا ناسور''۔

''فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگائی جائے۔''

ان سرخیوں کو پڑھنے والا بظاہر یہ سمجھے گا کہ یہ ہندستان کے بارے میں کوئی خبر ہے مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ پاکستان کے بارہ میں ہے۔ پہلی سرخی لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۹ اپریل ۱۹۹۲ء) کے صفحہ اول سے لی گئی ہے۔ اور دوسری سرخی نوائے وقت (۲۷ اگست ۱۹۹۲) کے صفحہ اول سے۔

پہلی سرخی کے تحت جو رپورٹ درج ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ تقسیم سے پہلے برصغیر ہند میں جب پاکستان کی تحریک چلی تو ہر فرقہ اور ہر مسلک کے لوگ آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ برصغیر ہند کی پوری مسلم قوم ایک گلستان اخوت بنی ہوئی تھی جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگ اکٹھا ہو کر مہکتے تھے۔ مگر اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ آج پاکستان میں ملت اسلامیہ کا یہ اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ آج پاکستان کے چاروں طرف فرقہ وارانہ خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔

پاکستانی جائزہ نگار نے لکھا ہے کہ جب ''ہم سب ایک ہی گلستان کے پھول ہیں تو پھر یہ کانٹے کہاں سے آئے۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ امت اسلامیہ میں یہ کانٹے اغیار اور کفار نے پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی راہوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے اتحاد واشتراک کو پارہ پارہ کر دیا''۔

پاکستانی لیڈروں نے ''اغیار اور کفار'' سے الگ ہونے ہی کے لئے پاکستان بنوایا تھا۔ پھر جب انھوں نے بے شمار قربانیوں کے بعد مسلمانوں کو اغیار اور کفار کے پڑوس سے علیحدہ کر کے پاکستان بنوالیا تو اس کے بعد وہ کون تھا جس نے گلستان اخوت کو خارزار اخوت بنا دیا۔

گلستان کو خارستان بنانے کی ذمہ داری غیروں پر ڈالنا سراسر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کے مطابق، ہر فرد اور ہر گروہ خود اپنے کئے کو بھگتتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے مسئلہ کا حل خود اپنی داخلی اصلاح ہے نہ کہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف احتجاج وفریاد۔

منزل کا نشانہ

انگلینڈ اور فرانس کے درمیان ایک سمندری کھاڑی ہے۔ اس کو انگلش چینل کہا جاتا ہے۔ جس مقام پر اس کا پاٹ سب سے کم ہے وہاں وہ ۲۱ میل چوڑی ہے۔ اب اس کے نیچے ایک سرنگ بنائی گئی ہے جو انگلینڈ اور فرانس کے درمیان بذریعہ روڈ سفر کو ممکن بناتی ہے۔

تیراک لوگ ہمیشہ اس کے شوقین رہے ہیں کہ وہ تیر کر انگلش چینل کو پار کریں۔ سب سے پہلے ۱۸۷۵ میں ۲۷ سالہ میتھو ویب (Matthew Webb) نے تقریباً ۲۱ گھنٹہ تیرتے ہوئے اس کو پار کیا تھا۔ اس کے بعد سیکڑوں لوگ بار بار اس کو پار کر چکے ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ مختلف قسم کی کہانیاں وابستہ ہیں۔

امریکی خاتون فلارنس شاڈوک (Florence Chadwick) پہلی خاتون ہیں جنھوں نے انگلش چینل کو تیر کر پار کرنے کی کوشش کی۔ پہلی بار وہ ناکام رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو دونوں طرف سے پار کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ فرانس کی طرف سے ۱۹۵۰ میں، اور انگلینڈ کی طرف سے ۱۹۵۱ میں۔ پہلی ناکامی کے بعد فلارنس شاڈوک نے اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اپنی ناکامی کے لئے کوئی عذر پیش نہیں کروں گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر میں اپنی منزل کو بخوبی طور پر اپنے سامنے رکھ سکتی تو میں کامیاب ہو جاتی۔ منزل کا تصور آپ کو برابر آگے کے لئے متحرک رکھتا ہے:

> I'm not offering excuses, but I think I could have made it if I had been able to see my goal. Goal gives you a vision that keeps you pressing on.

یہ صرف تیراکی کی بات نہیں۔ یہی بات زندگی کے تمام معاملات کے لئے درست ہے۔ زندگی کا سفر ایک غیر ہموار سفر ہے۔ جب آدمی کے سامنے ایک واضح مقصد ہو تو وہ ساری ناخوش گواریوں کو انگیز کرتے ہوئے بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور جو آدمی واضح نشانہ سے محروم ہو وہ کسی بھی مقام پر تھک کر بیٹھ جائے گا، وہ زیادہ آگے تک نہیں جا سکتا۔

یہ قیادت

پانچویں صدی عیسوی میں یونان میں کچھ ایسے سیاسی لیڈر ابھرے جنہوں نے لوگوں کے وقتی اور سطحی جذبات کو بھڑکا کر عوامی مقبولیت حاصل کی۔ ایسے کسی لیڈر کو اس زمانہ میں ڈیما گاگ (Demagogue) کہا گیا۔ ان میں سے ایک مشہور نام کلیون (Cleon) کا ہے۔ وہ ایک بلند آواز آدمی تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر اس بات کی خصوصی صلاحیت تھی کہ وہ عوام پسند زبان میں کلام کر سکے۔ اس نے وقت کے نظام حکومت کے خلاف پر جوش تقریریں کر کے عوام کے اندر مقبولیت حاصل کر لی۔ (8/357)

موجودہ زمانہ میں ڈیما گاگ کا لفظ اس سیاسی لیڈر کے لئے بولا جاتا ہے جو لوگوں کے جذبات اور تعصبات کو مخاطب کرے اور اس طرح ان کے درمیان لیڈری اور مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ عوامی خواہشات کا نمائندہ بن کر عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کر لے (111/454-55) ویبسٹر کی ڈکشنری میں ڈیما گاگ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ ایک شخص جو عوام کے جذبات اور ان کے تعصبات وغیرہ کو بھڑکائے اور اس طرح ان کا لیڈر بن کر اپنے ذاتی مفادات کو پورا کرے:

A person who tries to stir up the people by appeals to emotion, prejudice, etc., in order to become a leader and achieve selfish ends.

قیادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قائد وہ ہے جو عوام کے پیچھے چلے۔ جو عوامی جذبات کی ترجمانی کرے۔ دوسرا قائد وہ ہے جو عوام کو خود اپنے پیچھے چلائے، جو اصولوں کی نمائندگی کرنے والا ہو۔ پہلے قسم کے قائد کو موجودہ زمانہ میں ڈیما گاگ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے قائد کو ہمیشہ زبردست مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا قائد عوام کو اپنا وکیل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے گرد بہت جلد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس معاملہ دوسری قسم کی قیادت کا ہے۔ ایسا قائد اپنے اعلیٰ ترین اوصاف کے باوجود عوام کے اندر اجنبی بن جاتا ہے۔ اس کے گرد لوگوں کی بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہیں چلتا بلکہ وہ برتر اصولوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ ایسے قائد کو اکثر یہ کام کرنا پڑتا ہے کہ وہ بولنے والوں کو چپ کرائے اور چلنے والوں کو روکے۔

تیسرا امکان

برطانیہ کی خاتون اسکالر کیرن آرم اسٹرانگ(Karen Armstrong) ایک منصف مزاج خاتون ہیں۔ اسلام کے بارہ میں ان کی تحریریں عدل وانصاف پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قابل مطالعہ کتاب لندن سے ۱۹۹۱ میں چھپی ہے۔ ۲۸۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام یہ ہے:

Muhammad: A western attempt to understand Islam

اس کتاب میں انہوں نے موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانہ کا انقلابی اسلام، اپنے انتہا پسندانہ اور سفید وسیاہ حل کے ساتھ ایک نوجوان کا مذہب ہے:

> Radical Islam with its extreme and black-and-white solutions, is a young person's faith. (p. 12)

معاملہ کو بلیک اینڈ وہائٹ میں لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صرف دو حالتوں کے درمیان سوچ سکے۔ مثلاً اگر اس کے ملک میں بظاہر ایک غیر صالح حکمراں ہے تو وہ یہ سمجھے کہ اس کو کسی نہ کسی طرح اقتدار سے ہٹادو اس کے بعد اپنے آپ صالح حکومت قائم ہو جائے گی۔ مگر زندگی اس طرح صرف دو صورتوں کے درمیان نہیں ہوتی۔ عین ممکن ہے کہ آپ دھوم مچا کر غیر صالح حکمراں کا خاتمہ کریں اور اس کے بعد عملاً ایک تیسری صورت سامنے آجائے، یعنی ایک اور غیر صالح حکمراں کا اقتدار پر قبضہ۔

جو لوگ معاملات کو سفید وسیاہ کی صرف دو صورتوں میں دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ اصلاح کے نام پر تباہی لانے کا سبب بنتے ہیں۔ حقیقی اصلاح کے لئے ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو دو صورتوں کے دائرہ سے باہر آکر تیسرے امکان کو دیکھ سکے، جو یہ جانے کہ ہر ایسا اقدام باطل ہے جو عملی طور پر ایک نظام فساد کو ہٹا کر دوسرے نظام فساد کی آمد پر منتج ہونے والا ہے۔

انتظار بھی حل ہے

مختلف زبانوں میں جو مثلیں مشہور ہیں وہ دراصل لمبے انسانی تجربات کے بعد بنی ہیں۔ ان میں سے ہر مثل کامیابی کا ایک یقینی فارمولا ہے۔ اسی طرح کی ایک انگریزی کہاوت ہے — انتظار کرو اور دیکھو:

Wait and see.

امریکا کا مشہوری رائٹر ہنری ڈیوڈ تھارو (Henry David Thoreau) ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۲ میں اس نے وفات پائی۔ اس کا قول ہے کہ ہیرو وہ ہے جو یہ جانے کہ کہاں انتظار کرنا ہے اور کہاں جلدی کرنا ہے۔ ہر بھلائی اس انسان کے حصہ میں آتی ہے جو دانش مندانہ طور پر انتظار کرے:

The hero knows how to wait as well as to make haste. All good abides with him who waiteth wisely.

زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحے آتے ہیں جب کہ آدمی کو فوری طور پر ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اگر آدمی فوری فیصلہ کرنے میں چوک جائے تو اس کے بعد اس کے لیے جو چیز ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ گھبرا کر یا جلد بازی میں بے فائدہ کارروائیاں کرنے لگے۔ اب اس کو انتظار کرنا چاہیے۔ عقلمند وہ ہے جو اس فرق کو جانے کہ کب فوری فیصلہ لینا ہے اور کب معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظار بھی ایک عمل ہے۔ انتظار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ انتظار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے معاملہ کو فطرت کے نظام کے حوالہ کر دیا۔ وہ خدا کے فیصلہ کا منتظر بن گیا۔

اگر وقت پر صحیح فیصلہ لینا کامیابی ہے تو ناموافق حالات میں انتظار کی پالیسی اختیار کرنا بھی کامیابی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا نتیجہ حال میں نکلتا ہے اور دوسرے کا نتیجہ مستقبل میں۔

کامیاب فارمولا

بنگلور کے ڈاکٹر احمد سلطان انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگران کا مزاج برعکس طور پر یہ تھا کہ محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ۱۳ دسمبر 1999 کو تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

وہ جب بھی دہلی آتے تو مجھ سے ملتے اور اپنے ''کامیاب فارمولا'' کی سبق آموز مثالیں بیان کرتے۔ ایک بار ان کے صاحبزادے رات کے وقت گاڑی لے کر باہر نکلے۔ وہ گیارہ بجے واپس آئے تو وہ گاڑی باہر کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوئے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ ڈاکٹر احمد سلطان صاحب نے دروازہ کھولا تو دو ہندو نوجوان باہر کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے غصہ کے لہجے میں بتایا کہ آپ کے صاحبزادہ نے ہمارے اسکوٹر کو ٹکر ماری اور پھر بھاگ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے نرمی سے کہا کہ اندر تشریف لائیے، بیٹھ کر بات ہوگی۔ دونوں اندر آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک میز کے کنارے کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ اس وقت سردی کا موسم ہے۔ آیئے ہم لوگ پہلے چائے پئیں پھر بات کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا غصہ ختم ہو چکا تھا، دونوں خوش خوش واپس چلے گئے۔

ایک بار ایک ہندو نوجوان ان کے پاس آیا۔ اس نے رو کر کہا کہ میں ایک بڑے مسئلہ سے دوچار ہوں۔ آپ میرا مسئلہ حل کیجئے۔ اس نے بتایا کہ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ اس کے بعد میرے باپ نے مجھ کو گھر سے نکال دیا۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں اور ابھی تک وہ راضی نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم انہیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تم خاموشی سے جاؤ اور اپنے باپ کے قدموں پر سر رکھ کر کہو کہ اے باپ، میری غلطی کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کے باپ نے اس کو ڈانٹا۔ بیٹا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کے بعد باپ کا جذبۂ

پدری ابھر آیا۔ اس نے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ چند منٹوں کے اندر ساری بات ختم ہوگئی۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب ایک شہر میں گئے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بتایا کہ جلد ہی یہاں کٹر ہندوؤں کا ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ زبردست تیاری کر رہے ہیں۔ وہ اپنا جلوس مسلم محلہ سے لے جائیں گے اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر فساد کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ میرا ایک مشورہ مان لیجئے اور پھر یہاں کوئی فساد نہیں ہوگا۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ جس دن جلوس نکلنے والا ہو، بازار سے دو درجن پھولوں کے ہار لے آیئے۔ جب ان کا جلوس آپ کی مسجد کے سامنے پہنچے تو آپ لوگ پھولوں کا ہار لے کر باہر آئیں اور جو ہندو جلوس کے آگے آگے چل رہے ہیں ان سے کہیں کہ ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں اور پھر ان کے گلے میں ایک ایک ہار ڈال دیں۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس دن وہاں ہندو مسلم ٹکراؤ ہونے والا تھا، وہ ان کے لئے ہندو مسلم ملاپ کا دن بن گیا۔

ایک بار بنگلور میں وہ اپنے گھر کے قریب سڑک پر چل رہے تھے۔ پیچھے سے شہر کے ایک ہندو کی گاڑی آئی جو مسلمانوں کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ اس کی گاڑی ڈاکٹر صاحب سے ٹکرا گئی اور ڈاکٹر صاحب سڑک پر گر پڑے۔ ان کو کئی جگہ زخم آئے۔ مذکورہ ہندو اپنی گاڑی روک کر ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ میری گاڑی پر بیٹھ جائیں میں آپ کو لے کر اسپتال چلتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ مسلم علاقہ ہے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو دیکھ لیا تو وہ تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے سخت اصرار کر کے اس کو وہاں سے بھیج دیا۔ اس کے بعد مذکورہ ہندو ہمیشہ کے لئے ڈاکٹر صاحب کا دوست بن گیا۔

ڈاکٹر سلطان کے دل میں کسی کے لئے نفرت نہ تھی۔ وہ ہر ایک کو پیار و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ کامیاب فارمولا اپنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس دنیا میں محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ مگر نادان لوگ نفرت کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھ لیتے ہیں۔

ترقی کے مواقع

1999 کے سروے کے مطابق، ہندستان میں اس سال کا سب سے زیادہ امیر بنگلور کا ایک مسلمان تھا جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس سال اس کا سرمایہ ۱۷۶ بلین روپئے تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی کے مواقع لامحدود ہیں۔ حتی کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اقلیتی فرقہ کا ایک فرد ترقی کر کے اکثریتی فرقہ سے آگے بڑھ جائے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جون 1999)

ممتاز تعلیمی ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (بمبئی) کے ۳۷ ویں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے کانوکیشن ایڈریس میں جناب عظیم ہاشم نے اپنے تجربات بتائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم ہاشم کی ترقی ۲۵ سال کی لگاتار محنت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے لمبی مدت تک یہ کیا کہ ایک طرف خود اپنی صلاحیتوں کو آخری حد تک اپنے کاروبار میں لگادیا۔ دوسری طرف انھوں نے بار بار سفر کر کے ملک بھر سے اعلیٰ قابلیت کے نوجوان حاصل کئے اور ان کے ذریعہ ایک بہترین ٹیم تیار کی۔ انھوں نے اپنے اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کامیابی کا سب سے بڑا راز کبھی ختم نہ ہونے والی سخت محنت ہے۔ اس طرح طویل منصوبہ بند عمل کے ذریعہ انھوں نے اپنی موجودہ کامیابی حاصل کی۔ عظیم ہاشم نے کہا کہ: ”مستقبل وہ نہیں ہے جو آپ کے ساتھ پیش آتا ہے بلکہ مستقبل وہ ہے جسے آپ خود بناتے ہیں۔“

اس دنیا میں ہر آدمی وہی ترقی حاصل کر سکتا ہے جو ترقی کسی دوسرے نے حاصل کی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اپنی مطلوب کامیابی کے لئے اس کے مطابق ضروری عمل کیا جائے۔

وہ عمل کیا ہے۔ وہ عمل ہے ـــــ مقصد کا واضح تصور، اس کو پانے کا عزم مصمم، اپنی پوری صلاحیت کو اس میں لگادینا، لائق افراد کے ذریعہ متحدہ کوشش کرنا، ہر چیلنج سے نیا حوصلہ لینا، اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہنا، یہی اس دنیا میں کامیابی کے اصول ہیں۔ اور جو آدمی ان اصولوں کو بھر پور طور پر اپنا لے اس کے لئے ترقی اتنا ہی زیادہ یقینی بن جاتی ہے جتنا کہ شام کے بعد اگلی صبح کا طلوع ہونا۔

کردار کا کرشمہ

جناب اقبال احمد صاحب (پیدائش ۱۹۳۱) مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ وہ کلکٹریٹ کی سروس میں تھے۔ ۱۹۹۰ میں سینئر ایڈمنسٹریٹیو آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اب وہ مراد آباد میں مقیم ہیں۔(فون نمبر 0598-323029)

۱۴ فروری ۲۰۰۰ کو ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میں گورنمنٹ سروس میں تقریباً چالیس سال رہا۔ مگر مجھے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں ہوئی جس کو عام طور پر تعصب کہا جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم اسلامی کردار کے مطابق رہیں تو ہم ہر جگہ اور خود ہندستان میں نہایت عزت کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

مثلاً انھوں نے بتایا کہ مراد آباد کے کلکٹریٹ میں ۱۲ سال تک میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا پیش کار رہا ہوں۔ وہاں مجھے مکمل آزادی حاصل تھی۔ اس مدت میں وہاں ۱۳ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بدلے مگر میں بدستور اپنی سیٹ پر قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ایک میرے بارے میں اچھی رپورٹ دیتا تھا، اس لئے مجھ کو ہر آنے والے افسر سے وہی عزت ملی جو مجھے جانے والے افسر سے ملی تھی۔

انھوں نے بتایا کہ میرے خلاف لوگوں کی طرف سے اکثر بے بنیاد شکایتیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس آتی تھیں۔ لیکن انھوں نے کبھی ان پر دھیان نہیں دیا۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی اور وہ جناب اقبال احمد صاحب کی کامل دیانت داری (honesty) تھی۔ سروس کی پوری مدت میں ان کا کردار اتنا اعلیٰ رہا کہ کسی کو ان کے خلاف کسی حقیقی شکایت کا موقع نہیں ملا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ کلکٹریٹ کے کچھ ملازمین نے ان کے خلاف ایک تحریک چلائی۔ ان کو شکایت تھی کہ اقبال احمد صاحب کو یہاں اتنی عزت کیوں حاصل ہے کہ عام قاعدہ کے خلاف ان کا کبھی تبادلہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی کرسی پر لمبی مدت سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ اس وقت کے

A.D.M.(E) کے پاس آئے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ حسب قاعدہ تین سال کے اندر ہر ایک کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے مگر اقبال صاحب اپنی کرسی پر بدستور قائم ہیں۔ کیوں ان کا تبادلہ نہیں کیا جاتا۔ اے ڈی ایم مسٹر مہیشوری نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ کا کہنا درست ہے ہم اقبال صاحب کا تبادلہ کر دیتے ہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ ہم کو اقبال کی جگہ دوسرا اقبال چاہئے۔ وہ یہاں بیک وقت کئی آدمیوں کا کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے حد درجہ پابند ہیں۔ وہ روزانہ تین ٹیلیفون کو سنبھالتے ہیں۔ ہم صرف اشارہ کر دیتے ہیں اور وہ انگریزی یا ہندی میں بہترین draft بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اور ہمارا کام صرف دستخط کرنا ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آپ ایک ایسا آدمی لائیے جوان کی جگہ لے سکے۔ اس کے لئے ہم آپ کو دو دن کا وقت دیتے ہیں۔ مگر یہ شکایت کرنے والے ملازمین خود بھی اقبال صاحب کی اعلیٰ خصوصیات سے واقف تھے، چنانچہ وہ ان کی قائم مقامی کے لئے کسی اور آدمی کا نام پیش کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اور اقبال احمد صاحب اپنی سروس پر اسی عزت کے ساتھ آخر وقت تک باقی رہے۔

زندگی میں کامیابی کا راز اعلیٰ کردار ہے۔ اعلیٰ کردار کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ کوئی بھی تعصب یا سازش ایسے آدمی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوسکتی جو اعلیٰ کردار کی صفت اپنے اندر رکھتا ہو۔

اصل یہ ہے کہ ہر دفتر یا ہر ادارہ کو کارکنوں کی ضرورت ہے۔ اگر دس امیدوار ہوں اور سب کے سب برابر کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ایسی حالت میں یہ ممکن ہے کہ انتخاب کرنے والے لوگ کسی ایک کے حق میں جانب داری کا معاملہ کریں اور نو برابر کو چھوڑ کر ایک برابر کو لے لیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ ان میں سے نو افراد برابر کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ایک امتیازی صلاحیت کا مالک ہو تو یقینی طور پر اسی ایک کے حق میں فیصلہ ہوگا جو امتیازی درجہ میں اپنی اہلیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ کیوں کہ یہ ہر آدمی کی اپنی ضرورت ہے کہ اس کے پاس اعلیٰ درجہ کے کارکن موجود ہوں۔

امتیاز ہر تعصب اور جانب داری کی کاٹ ہے۔ صاحب امتیاز انسان کے لئے ہر سیٹ اس کی اپنی سیٹ ہے۔ وہ جب چاہے جس سیٹ پر بیٹھ جائے۔ اسی حقیقت کو ایک انگریزی مقولہ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ ”ٹاپ کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے“: .There is always room at the top

اعلیٰ کردار کا کرشمہ صرف کچھ لوگوں کے لئے مخصوص نہیں۔ ہر آدمی یہ کرشمہ پیدا کرسکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اس کی ضروری قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔

صاحب کرشمہ آدمی پیٹ سے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذاتی محنت سے بنتا ہے۔ محنت اور لگن اور منصوبہ بند تیاری اس کی لازمی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا کرے وہ یقینی طور پر اعلیٰ کردار کا حامل انسان بن جائے گا جس کو کرشمہ ساز انسان کہا جاتا ہے۔ اور ٹاپ کی جگہ ہر دن ایسے اعلیٰ افراد کا انتظار کر رہی ہے۔ کریب (Crabbe) نے درست طور پر کہا ہے کہ: امتیاز ہر اس آدمی کے لئے قابل حصول ہے جو اس کے لئے کوشش کا ارادہ رکھتے ہوں:

Excellence is attainable by all who have the will to strive for it.

چند سال پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب کا ٹیلیفون میرے پاس آیا۔ انہوں نے خوشی کے لہجے میں کہا کہ آج مجھے غلامی کی زندگی سے نجات مل گئی۔ مزید پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اب میں گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آزاد زندگی گذاروں۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر سب سے طاقتور جذبہ انا (ego) کا جذبہ ہے۔ عام زندگی میں آدمی جو کچھ کرتا ہے آزادانہ طور پر کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کا پابند نہیں۔ مگر سرکاری ملازمت میں آدمی کو اپنے افسر کا اور دوسرے ملازمین کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ملازمت کی زندگی اس کو پابندی کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ آزاد پیشے میں اس کی انا مجروح نہیں ہوتی۔ مگر سرکاری ملازمت میں بار بار اس کو اپنی انا مجروح ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

آدمی آزاد پیشے میں بھی کام کرتا ہے اور ملازمت میں بھی۔ اگر اس کا شعور اس طرح زندہ ہو کہ وہ چیزوں کو انا کا مسئلہ نہ بنائے تو ملازمت کی زندگی بھی اس کو اسی طرح باعزت زندگی نظر آئے گی جس طرح آزاد پیشہ اس کو باعزت زندگی معلوم ہوتا ہے۔

زیادہ بڑی گود

ہندستانی روایات میں ایک کہانی اس طرح ہے کہ ایک راجہ کے یہاں دو رانیاں تھیں۔ دونوں رانی کے یہاں ایک ایک بچہ تھا۔ دونوں کے درمیان رقابت رہتی تھی۔ ایک دن ایک رانی کا بچہ راجہ کی گود میں آکر بیٹھ گیا۔ دوسری رانی نے اس منظر کو دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر آئی اور دوسری رانی کے بیٹے کو ہٹا کر اپنے بیٹے کو راجہ کی گود میں بٹھادیا۔

بچہ روتا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا اور پورا قصہ بتایا۔ ماں نے کہا کہ اے میرے بیٹے، تم پرم پتا کی گود میں بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد تمھیں ان باتوں کی شکایت نہ ہوگی۔

یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ تاہم اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ انسان عام طور پر مختلف قسم کی شکایتیں لئے رہتا ہے۔ اس کو اپنے گھر والوں کی طرف سے اور سماج کے لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے ناپسندیدہ تجربات پیش آتے رہتے ہیں جو شکایت بن کر اس کے سینہ میں بس جاتے ہیں۔ مگر یہ سب بہت چھوٹی باتیں ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ آدمی خدا کی یادوں میں جینے والا بنے۔ وہ اپنا سارا بھروسہ خدا پر قائم کرے۔ وہ خدا کی دی ہوئی چیزوں کی عظمت میں اس طرح گم ہو کہ اس کو یاد ہی نہ رہے کہ کسی اور نے اس کو کیا دیا اور کیا نہیں دیا۔

انسانوں سے شکایت دراصل خدا سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ خدا کی طرف سے انسان کو جو بے شمار نعمتیں ملی ہوئی ہیں وہ ایک اتھاہ سمندر کی مانند ہیں اور انسانوں کی طرف سے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔ عطیات الٰہی کے اس سمندر میں اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ایک قطرہ اور ڈال دے تو سمندر میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس سمندر سے ایک قطرہ نکال لے تب بھی اس میں کوئی کمی واقع ہونے والی نہیں۔

ہر آدمی ''پرم پتا'' کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس واقعہ کا شعوری ادراک اگر پوری طرح حاصل ہو جائے تو آدمی بڑی سے بڑی شکایت کو اس طرح نظر انداز کر دے گا جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

فطری حل

ہندستان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان اکثریتی فرقہ کی طرف سے تعصب اور زیادتی کا شکار ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے یہ مواقع نہیں کہ وہ پر امن طور پر یہاں رہیں اور تعمیر وترقی کے راستہ میں سرگرم ہوں۔ مگر یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو تباہ کیا جارہا ہے اس سے پوچھئے کہ تم خود کیوں تباہی سے بچے ہوئے ہو۔ اسی طرح جو مسلم اخبار اس قسم کی باتیں چھاپے اس کے بارے میں تحقیق کیجئے کہ اس اخبار کا مالک تباہی کا شکار ہے یا ترقی کررہا ہے۔ تقریباً یقینی ہے کہ ہر بار تحقیق سے یہی معلوم ہوگا کہ جو لوگ مسلمانوں کو اس قسم کی خبریں سناتے ہیں وہ خود اس ملک میں زبردست ترقی کئے ہوئے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دوسرے ملک کی طرح ہندستان میں بھی بعض استثنائی واقعات ہوتے ہیں۔ اب لکھنے اور بولنے والے لوگ یہ کرتے ہیں کہ انہی استثنائی واقعات کو بڑھا چڑھا کر چھاپتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں ہندستان کی ایک ایسی تصویر بنتی ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں۔ وہ استثناء کو عموم سمجھ لیتے ہیں حالانکہ اس قسم کا استثناء ہمیشہ اور ہر سوسائٹی میں موجود رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منفی واقعات اگر ایک فیصد ہیں تو مثبت واقعات ۹۹ فیصد۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک مثبت واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مشتاق احمد صاحب (پیدائش ۱۹۳۲ء) سے ۱۷ فروری ۲۰۰۰ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ حج کے لئے جاتے ہوئے دہلی میں ٹھہرے تھے۔ وہ شیوگنج (راجستھان) کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں حج کے ارادہ سے شیوگنج سے روانہ ہوا تو وہاں کے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ ہر ایک نے مجھے ہار پہنایا۔ تقریباً ڈیڑھ سو آدمی پہنچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن آئے۔ ان میں کافی تعداد ہندوؤں کی تھی۔

ہر ایک نے کہا کہ وہاں پہنچ کر ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔

انہوں نے بتایا کہ شیو گنج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ شر پسند افراد یہاں آتے ہیں مگر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک کٹر ہندو لیڈر ۱۹۹۲ء میں آئے۔ انہوں نے رات کے جلسہ میں نہایت زہریلی تقریر کی۔ انہوں نے ہندوؤں سے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کرواور ان سے لین دین نہ کرو اور کوئی دکان انہیں کرایہ پر نہ دو۔ اگر دیا ہو تو زبردستی خالی کرالو، وغیرہ۔ واضح ہو کہ شیو گنج کی تجارت تقریباً ۹۹ فی صد ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔

مشتاق صاحب نے یہ قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ شیو گنج میں مسلمان صرف پانچ فی صد ہیں۔ رات کی اس زہریلی تقریر کے بعد ہم لوگ یہ سوچنے لگے کہ دیکھیں صبح کو کیا ہوتا ہے۔ تاہم مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ نہیں کیا، نہ جلسہ کے اندر اور نہ جلسہ کے باہر۔

اس انتہائی دل آزار تقریر کے باوجود شیو گنج کے مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاجی کارروائی نہیں کی۔ صرف یہ ہوا کہ جناب محمد امین صاحب جو شیو گنج کے ایک مسلم تاجر ہیں وہ وہاں کے ایک ہندو پنڈت پکھراج شریمالی سے ملے۔ وہ وشو ہندو پریشد کے مقامی لیڈر ہیں۔ محمد امین صاحب نے ان سے پوچھا کہ رات کو جو تقریر مہاراج نے کی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا آپ اس کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ پنڈت پکھراج شریمالی صاحب نے جواب دیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ شیو گنج میں ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے آئے ہیں اسی طرح رہیں گے۔ یہاں اس کا کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ چنانچہ خود یہاں کے ہندوؤں نے مذکورہ تقریر کی بھرپور بھرشنا (مذمت) کی اور شیو گنج کے ماحول میں اس کا کوئی عملی اثر نہیں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت امن کو پسند کرتی ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر معتدل ماحول چاہتا ہے کیوں کہ معتدل ماحول میں ہر ایک کا فائدہ ہے۔ جب شیو گنج کے مسلمانوں نے اپنی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی تو گویا کہ انہوں نے انسانی فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دیا۔ اور انسانی فطرت اپنا وزن ہمیشہ امن کے حق میں ڈالتی ہے۔ اس کے خلاف صرف اس وقت ہوتا ہے جب

کہ کوئی نادان لیڈر کھڑا ہوا اور جوابی اشتعال انگیزی کر کے معاملہ کو غیر ضروری طور پر اس طرح بڑھائے کہ فطرت کے لئے اپنا کام کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

فطرت کا ایک اصول

زمین پر چھوٹے بڑے بے شمار حیوانات ہیں۔ وہ ہر لمحہ اپنے اندر سے گندگی نکالتے رہتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زمین بدستور صاف ستھری حالت میں موجود رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ حیوانی غلاظت سے بھر جائے۔

اس کا سبب فطرت کا ایک قانون ہے۔ جب بھی کوئی حیوان غلاظت خارج کرتا ہے تو عین اسی وقت بے شمار چھوٹے چھوٹے ناقابلِ مرئی کیڑے (bacteria) اس پر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کو ڈیکمپوز (decompose) کر کے گیس کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ گیس اوپر اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

یہ فطرت کا ایک عام قانون ہے۔ وہ جس طرح بقیہ دنیا میں جاری ہے اسی طرح وہ انسانی دنیا میں بھی جاری ہے۔ جب بھی انسانی دنیا میں کوئی برائی پیدا ہوتی ہے تو عین اسی وقت قدرت کا قانون عمل میں آجاتا ہے۔ وہ اس برائی کو ختم کر کے دوبارہ اس کو معتدل حالت میں قائم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ناخوشگوار صورت حال پیش آنے کے بعد اگر ہم خود اقدام نہ کریں تو فطرت اپنے آپ اس کے خلاف سرگرم ہو جائے گی۔ اور ناخوشگوار صورت حال کو دوبارہ خوش گوار صورت حال میں تبدیل کر دے گی۔ انسان کی مداخلت کا انجام یقینی نہیں مگر فطرت کی مداخلت کا انجام یقینی ہے، فطرت خدا کے قانون کا نام ہے۔ اور خدا کا قانون جب عمل میں آجائے تو اس کو انجام تک پہنچنے سے کوئی روکنے والا نہیں۔

دردناک انجام

دمشق کی تاریخ کے ساتھ جن لوگوں کے نام شامل ہیں ان میں سے ایک ٹی ای لارنس (T.E.Lawrence) ہے۔ یہ ایک انگریز تھا جو ۱۸۸۸ میں پیدا ہوا۔ اس نے عرب علاقہ کی تاریخ پڑھی اور عربی زبان سیکھی۔ اس کے بعد عربی لباس پہن کر عربوں کے درمیان داخل ہو گیا۔ ۱۹۱۴۔۱۸ کے درمیان اس نے دمشق کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس وقت عرب ممالک بشمول شام پر ترکوں کی حکومت تھی۔ لارنس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ عربوں میں ترکوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ عربوں کے اندر عرب قومیت کا جذبہ اتنی شدت سے ابھرا کہ انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ لارنس کی یہ کہانی حسب ذیل کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے:

Lawrence of Arabia, by Richard Aldington

کرنل لارنس بظاہر اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ مگر اس کا آخری انجام نہایت دردناک تھا۔ انگریزی حکومت نے اس کو اس کے حوصلہ کے بقدر "انعام" نہیں دیا۔ وہ مایوسی کے عالم میں ۲۶ فروری، ۱۹۳۵ کو رائل ایئر فورس سے ریٹائر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے آخری ایام گزارنے کے لئے کلاوڈس ہل (Clouds Hill) چلا گیا۔ وہ ایک شکستہ دل انسان کی طرح یہاں اپنے صبح و شام گزار رہا تھا کہ ۱۳ مئی ۱۹۳۵ کو موٹر سائیکل کے حادثہ میں شدید زخمی ہو گیا۔ اور چھ دن تک بے ہوش رہ کر مر گیا۔

> A motorcycling accident on May 13, (1935) solved the problem of his future. He died six days later without regaining consciousness (10/727)

شیر کا طریقہ

امریکہ کی ایک سائنٹفک سوسائٹی ہے جو ۱۸۸۸ میں قائم ہوئی اس کا نام نیشنل جغرافی سوسائٹی (National Geographic Society) ہے۔ اس ادارہ نے خصوصی اہتمام کے تحت شیروں کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے۔ یہ فلم شیروں کی حقیقی زندگی پر مشتمل ہے جو افریقہ کے جنگلوں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ تیار کی گئی ہے۔ میں نے اس کو وی۔ سی۔ آر پر دیکھا ہے۔ اس ڈاکومنٹری فلم میں شیر کی حقیقی زندگی کے بہت سے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس میں ایک منظر یہ تھا کہ شیر ایک جانور کا شکار کرتا ہے۔ بکری کے قسم کے اس جانور کو وہ منہ میں دبا کر لاتا ہے اور اس کو پانی کے ایک تالاب کے کنارے رکھتا ہے۔ اس کے بعد شیر تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے ہٹ کر کہیں اور چلا گیا۔ وہ جب دوبارہ وہاں لوٹا تو وہاں یہ منظر تھا کہ تالاب کا ایک گھڑیال تیرتا ہوا کنارے کی طرف آیا۔ اس نے اپنا لمبا منہ نکال کر شکار کو اپنے منہ میں دبا لیا اور اس کے بعد وہ پیچھے کی طرف پانی میں جانے لگا۔ ابھی وہ جانور کو لے کر پوری طرح پانی میں داخل نہیں ہو پایا تھا کہ شیر وہاں آگیا۔

بظاہر یہ شیر کے لئے ایک سخت اشتعال انگیز لمحہ تھا۔ اس کے شکار کو ایک اور جانور اس کی آنکھوں کے سامنے لئے چلا جارہا تھا۔ مگر شیر خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے شکار کو چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ شکار اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ شیر کا طریقہ ہے۔ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہے، اس کے باوجود وہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ متحمل مزاج ہوتا ہے۔ وہ ٹکراؤ کے موقع پر آخری حد تک اعراض اور رواداری برتتا ہے۔ وہ طاقت کا استعمال صرف اس وقت کرتا ہے جب کہ اس کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔

حکمتِ اعراض

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۸ ستمبر 1999 میں لکھتے ہیں: میں نے ہندی اخبار "ہندستان" کا شمارہ ۲۸ ستمبر 1999 پڑھا۔ اس کے اداریہ میں یہ لکھا تھا کہ حال میں سورت (گجرات) میں "گنیش وسرجن" کا جلوس نکلا۔ اس موقع پر پولیس اور جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ پتھراؤ اور فائرنگ کے نتیجہ میں جلوس کے آٹھ افراد ہلاک اور کئی درجن زخمی ہو گئے۔ یہ جلوس شہر کے مسلم محلہ کی ایک مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلم اور ہندو یا مسلم اور پولیس کے درمیان لڑائی ہو جاتی مگر عملاً اس کا الٹا ہوا۔ مسلمانوں نے وہاں پر صبر کا رویہ اپنایا جس کی وجہ سے انھیں اس کا پھل مل گیا۔ اس میں کسی بھی مسلمان کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ ٹکراؤ انتظامیہ اور ہندوؤں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر آپ کی وہ بات یاد آگئی جو آپ "الرسالہ" یا کئی دیگر کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ (سہیل احمد، حسن البنا منزل، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ)

"سورت" کا یہ واقعہ تمام اخباروں میں آچکا ہے۔ اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سبق کی طرف الرسالہ میں بار بار نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ــــ مسلم کش فسادات کا اصل سبب جلوس کا نکلنا اور اس کا مسلم محلہ سے گزرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جب جلوس نکلے تو محلہ والے اس کے مقابلہ میں غیر حکیمانہ رویہ اختیار کریں۔ حکیمانہ رویہ ہمیشہ حفاظت کا ضامن ہوتا ہے اور غیر حکیمانہ رویہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔

اس معاملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جلوس کے وقت وہاں کے مسلمان اگر منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو مسئلہ مسلم ورسس پولیس بن جائے گا۔ اور اگر وہاں کے مسلمان ایسے موقع پر اعراض کا رویہ اختیار کریں تو سارا مسئلہ جلوس ورسس پولیس بن جائے گا۔ اس اصول کی صداقت بار بار فسادات کی صورت میں سامنے آچکی ہے۔ سورت کا مذکورہ واقعہ اس حکمت کی

ایک مثبت مثال ہے۔

دور اول کے مسلمان مخالفین کی سازشوں اور زیادتیوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) اب یہ غور کیجئے کہ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں صبر کس طرح ڈھال بن جاتا ہے۔ اور زیر سازش گروہ کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں رد عمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اشتعال انگیز صورت حال کو دیکھ کر آدمی بھڑک اٹھے اور فوری جذبات کے تحت جوابی کارروائی کرنے لگے۔ اور دوسرا یہ کہ فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو بلکہ اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملے پر غور کرے۔ اور اس کے بعد جو کچھ کرے ٹھنڈے ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر کرے۔

مذکورہ تقسیم میں پہلی قسم کے رد عمل کا نام غیر صابرانہ رد عمل ہے اور دوسری قسم کے رد عمل کا نام صابرانہ رد عمل۔ دوسرے لفظوں میں اس فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ غیر صابرانہ رد عمل پیش آمدہ صورت حال کا جذباتی جواب (emotional response) ہے۔ اس کے برعکس صابرانہ رد عمل یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں جو جوابی کارروائی کی جائے وہ ایک سوچا سمجھا جواب (considered response) ہو۔

صبر کوئی بے عملی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے سامنے کوئی ناپسندیدہ صورت حال پیش آئے تو وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اعلیٰ ترین بہادری ہے۔ جب ایک آدمی بے صبری کے ساتھ جذباتی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اس کے برعکس جب ایک آدمی صبر والی روش اختیار کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا۔ اس نے اپنے جذبات کو اپنی عقل پر غالب ہونے نہیں دیا۔

تقابل کا مسئلہ

امریکا کے ایک سفر میں میری ملاقات کچھ ایسے مسلمانوں سے ہوئی جو ہندستان سے جا کر امریکا میں آباد ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے ۔ ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ امریکہ میں ہمارے لئے پیس (امن) ہے، اور ہندستان میں ہمارے لئے پیس نہیں ۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ پیس کا تعلق کسی ملک سے نہیں ۔ بلکہ پیس کی ایک قیمت ہے، آپ جہاں بھی وہ قیمت ادا کریں، وہاں آپ کو پیس مل جائے گا۔ یہ قیمت ایڈجسٹمنٹ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ امریکہ میں بھی مسلمانوں کے لئے وہ تمام مسائل موجود ہیں جو ہندستان میں ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں وہ ان مسائل کو لے کر بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ اور امریکہ میں ان مسائل کے اوپر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں ان کے لئے امن ہے اور ہندستان میں ان کے لئے امن نہیں۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے پرسنل لاء میں مداخلت کا مسئلہ ہے، ملازمتوں میں امتیاز کا مسئلہ ہے، درسی کتابوں میں غیر اسلامی مضامین کا مسئلہ ہے، مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ ہے، وغیرہ۔ یہ تمام مسائل امریکا میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہندستان میں ان چیزوں کو لے کر احتجاجی سیاست چلاتے ہیں اور امریکہ میں ان چیزوں کو نظر انداز کر کے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی روش میں اسی فرق نے بے امنی کا مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ دو ملکوں کے فرق نے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اکثر لوگ غلط تقابل میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر فکری غلطیاں غلط تقابل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ صحیح تقابل سے صحیح فکر بنتا ہے اور غلط تقابل سے غلط فکر۔ اس دنیا میں صحیح رائے صرف وہ لوگ قائم کر سکتے ہیں جو اس فکری حکمت کو جانیں۔ جو لوگ اس فکری حکمت سے محروم ہوں وہ صحیح رائے سے بھی محروم رہیں گے۔

پرامن زندگی کاراز

نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب چھپی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں پرسکون زندگی گزارنے کا راز کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار پارک شائر (برطانیہ) سے 1970ء میں چھپی ہے۔ ۲۷۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

Thomas A Harris MD, I AM OK- YOU ARE OK

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی جب سماج میں زندگی گزارتا ہے تو دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی چار حالتیں ہو سکتی ہیں۔ انہیں کے الفاظ میں وہ چار حالتیں یہ ہیں:

1. I AM NOT OK — YOU ARE OK
2. I AM NOT OK — YOU ARE NOT OK
3. I AM OK — YOU ARE NOT OK
4. I AM OK — YOU ARE OK

یعنی پہلی حالت یہ ہے کہ میں ٹھیک نہیں اور تم ٹھیک ہو دوسری حالت یہ کہ میں بھی ٹھیک نہیں اور تم بھی ٹھیک نہیں۔ تیسری حالت یہ ہے کہ میں ٹھیک ہوں اور تم ٹھیک نہیں اور چوتھی حالت یہ ہے کہ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک۔ (p. 42)

کتاب کے مصنف کے نزدیک صرف آخری اور چوتھی حالت ہی درست حالت ہے۔ ابتدائی تین حالتیں درست نہیں۔ ابتدائی تین حالتوں میں آدمی کو ذہنی سکون (peace of mind) نہیں ہو سکتا، جب کہ آخری حالت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آدمی کو پوری طرح ذہنی سکون حاصل ہو جائے گا۔

مگر پرسکون زندگی کا یہ فارمولا کوئی درست فارمولا نہیں۔ یہ اس نظریہ پر مبنی ہے جس کو فلسفہ میں نظریہ افادیت (utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ نظریہ افادیت کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ —— یہ اصول کہ کسی چیز کی قدر و قیمت تمام تر اس کی عملی افادیت سے متعین ہوتی ہے:

The doctrine that the worth or value of anything is determined solely by its utility. (Webster's Dictionary)

نظریۂ افادیت کو اگر درست مان لیا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ حیوان کے اندر جبلی طور پر خیر وشر کے درمیان کوئی تمیز نہیں۔ حیوان اس فرق کو نہیں جانتا کہ اپنے مالک کے کھیت میں چارہ کھانا صحیح ہے اور غیر کے کھیت میں گھس کر اس کی فصل کھانا غلط۔ مگر انسان کی فطرت میں حق اور باطل کا فرق رکھا گیا ہے۔ وہ فطری طور پر ایک موقف کو درست اور دوسرے موقف کو غلط سمجھتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان جیسی مخلوق کے لئے یہ نظریہ درست نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاہ اور سفید دونوں کو ایک کہے۔ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک، جیسا نظریہ کوئی شخص مصنوعی طور پر تو اختیار کر سکتا ہے مگر حقیقی طور پر نہیں۔ ایک آدمی اگر دیانتدار (honest) ہے تو وہ اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ ایک حالت کو ٹھیک سمجھے اور اس کے برعکس حالت کے بارے میں اس کی رائے یہ ہو کہ وہ ٹھیک نہیں۔ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک کا نظریہ ایک تاجر کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے مگر ایک بااصول انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس قسم کے نظریہ کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں جہاں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق واختلاف پایا جاتا ہے۔ وہاں ٹکراؤ سے کیسے بچا جائے اور پر سکون زندگی کیسے حاصل کی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا درست فارمولا یہ ہے ـــــ میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہوں اور تم کو ناحق پر، مگر میں تمہارا مکمل احترام کروں گا۔ اس فارمولے میں پوری طرح پر امن زندگی حاصل ہو جاتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی فطری حقیقت مجروح ہوئی ہو۔

انسان کو مکمل انسانی زندگی گذارنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یقین (conviction) ہے اور اس یقین کے بغیر ایک انسان کی مثال اس درخت کی سی ہے جو اپنی جڑ سے اکھڑ گیا ہو۔ اور اس یقین کو حاصل کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اس احساس پر کھڑا

ہوا ہو کہ میں حق پر ہوں، میں نے سچائی کو پالیا ہے۔ یہی یقین اعلیٰ انسانیت کا سرچشمہ ہے اور ”میں بھی ٹھیک تم بھی ٹھیک“ عین اسی احساس سے انسان کو محروم کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ”میں بھی ٹھیک، تم بھی ٹھیک“ کا نظریہ انسان کے لئے ذہنی موت کے ہم معنیٰ ہے۔

اپنے آپ کو حق پر سمجھنا، یا یہ سمجھنا کہ میں نے سچائی کو پالیا ہے کسی بھی درجہ میں دوسروں کے خلاف نفرت یا حقارت کا سبب نہیں۔ بلکہ برعکس طور پر وہ محبت انسانی کا ذریعہ ہے۔ اس معاملہ میں نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ کسی آدمی کے لئے سچائی کی دریافت عین اسی وقت خود اپنے لئے فروتنی (modesty) کی دریافت ہوتی ہے۔ سچائی صرف ایک ایسی چیز ہو سکتی ہے جو آدمی سے بلند تر ہو۔ جو چیز آدمی سے بلند نہ ہو وہ سچائی بھی نہیں۔ ایسی حالت میں جو آدمی حقیقی طور پر سچائی کو دریافت کرے اس نے گویا ایک ایسی عظمت کو دریافت کیا جس کے مقابلہ میں وہ خود غیر عظیم تھا۔ سچائی نہ آدمی کے برابر ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کم۔ سچائی لازمی طور پر آدمی سے عظیم تر ہو گی۔

ایسی حالت میں سچائی کی دریافت کا سب سے بڑا معیار (criterion) صرف ایک ہے اور وہ فروتنی ہے۔ جو آدمی یہ دعویٰ کرے کہ اس نے سچائی کو دریافت کیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے اندر گھمنڈ یا برتری کا احساس ہو تو یقینی طور پر وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے جس چیز کو پایا ہے وہ خود اس کی اپنی ذات ہے نہ کہ برتر سچائی۔

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچائی کی تلاش کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a truth-seeking animal

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایک نامکمل مخلوق ہے۔ انسان کی فطرت ہر لمحہ اس کو کسی چیز کی دریافت کرنے پر اکساتی رہتی ہے جو اس سے برتر ہو، جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکے۔ یہ کہنا کہ انسان متلاشی حق ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ انسان اپنے سے برتر ایک ایسی چیز تلاش کر رہا ہے جس کے مقابلہ میں وہ اپنی حیثیت

واقعی کا تعین کر سکے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ سچائی کو پانا دوسرے لفظوں میں گویا اپنی فروتنی (modesty) کو پانا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کبر (arrogance) تمام برے جذبات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں تواضع ہر قسم کی اعلیٰ کیفیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسی حالت میں جب ایک آدمی سچائی کو دریافت کرتا ہے تو ایک طرف وہ اپنی ذات کے لئے یقین کو دریافت کرتا ہے اور دوسروں کی نسبت سے وہ ایک ایسی چیز دریافت کرتا ہے جس کی بنا پر وہ ان کے حق میں شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے احترام کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

پرامن سماجی زندگی بجائے خود ایک ضروری چیز ہے مگر پرامن سماجی زندگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ چیزوں کے درمیان فرق کو جانتے ہوئے بھی پرامن زندگی کا حصول ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پرامن زندگی کا تعلق پختگی (maturity) سے ہے نہ کہ "میں بھی ٹھیک، تم بھی ٹھیک" جیسے مصنوعی فارمولے سے۔

ہر آدمی اپنی ماں سے محبت کرتا ہے۔ ماں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ مگر اپنی ماں سے محبت کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی دوسرے کی ماں سے نفرت کرے۔ اپنی ماں سے گہری محبت کرتے ہوئے بھی آدمی دوسرے کی ماں کا مکمل احترام کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے دوسرے کی ماں کو بھی اپنی ماں کے طور پر تسلیم کیا ہو۔ انسان کے اندر فطری طور پر اتنی زیادہ وسعت ہے کہ وہ بظاہر مختلف چیزوں کو بیک وقت اپنے سینہ میں جگہ دے سکے۔ اسی بات کو ایک مغربی مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

I am large enough to contain all these contradictions.

سماجی ہم آہنگی کے معاملہ میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اختلاف (difference) کو کیسے ختم کیا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اختلاف کے ہوتے ہوئے کس طرح سماجی ہم آہنگی کے

مقصد کو حاصل کیا جائے۔ کیوں کہ اختلاف اور فرق خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اختلاف اور فرق کو ختم کرنا اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

ایسی حالت میں سماجی ہم آہنگی کا درست فارمولا باہمی اعتراف (mutual recognition) نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) ہے۔ اس معاملہ میں اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس تعمیری شعور کو بیدار کیا جائے کہ وہ اختلاف اور فرق کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے زندگی گزار سکیں۔

دنیا میں فرق یا اختلاف کا ہونا کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ ایک خوبی ہے جو انسانی ترقی کا زینہ ہے۔ فرق واختلاف والے ماحول ہی میں لوگ اس اعلیٰ انسانی صفت کی تربیت پاتے ہیں جس کو وسعت قلب اور فراخ حوصلگی کہا جاتا ہے اور جو ہر بڑی کامیابی کی لازمی شرط ہے۔

فرق واختلاف کے ماحول ہی میں فکری چیلنج ظہور میں آتے ہیں جو انسان کے لئے ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہیں۔ فرق واختلاف ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسانی ترقی کا سفر محدود نہ ہو کر وسیع الاطراف ہو جائے، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں بھی ٹھیک تم بھی ٹھیک" کا طریقہ کچھ پروفیشنل قسم کے لوگوں کے لئے محدود طور پر مفید ہو سکتا ہے، مگر وہ عام انسانیت کے لئے وسیع تر معنوں میں مفید نہیں۔

بامقصد زندگی نہ کہ پرراحت زندگی

۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک انگریزی کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب پہلی بار ٹورانٹو سے ۱۹۹۶ میں چھپی۔ میرے سامنے اس کا پیپر بیک ایڈیشن ہے جو سان فرانسسکو سے ۱۹۹۹ میں چھپا۔ اس کا نام یہ ہے:

The Monk Who Sold his Ferrari, A Fable about Fulfilling your Dreams and Reaching your Destiny— by Robin S. Sharma

اس کتاب میں پرمسرت زندگی کا از بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد اس پر غیر معمولی تبصرے کئے گئے۔ ایک مشہور مغربی مصنف جو ٹائی (Joe Tye) نے اس کتاب پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس کے بارہ میں کہا کہ ـــــــ سچی کامیابی اور خوشی کا ایک طاقتور اور شاندار فارمولا:

An elegant and powerful formula for true success and happiness.

یہ کتاب کہانی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس فرضی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ کا ایک کامیاب وکیل کافی پیسہ کمالیتا ہے۔ مگر اس کے بعد وہ ذہنی تناؤ (mental tension) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ تنگ آکر سکون کی تلاش میں اپنی بیش قیمت گاڑی (Ferrari) کو بیچ کر ہمالیہ پہاڑ پر چلا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک مفروضہ یوگی رمن سے ہوتی ہے۔ یوگی رمن اس کو اپنے خیالی جھونپڑے (hut) میں لے جاتا ہے جو پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

یوگی رمن امریکی وکیل کو بتاتا ہے کہ پرمسرت زندگی حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ پرمسرت زندگی کا سرچشمہ خود تمہارے اپنے اندر ہے۔ اپنے اندر چھپی ہوئی توانائی کو باہر لاؤ اور تم صحت مند اور پرمسرت زندگی حاصل کرلو گے۔ اس کے بعد یوگی رمن امریکی وکیل کو اس مقصد کے لئے کچھ خاص ٹکنیک بتاتا ہے۔ اس ٹکنیک کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول سامنے رکھ

کر اپنی نگاہ اس پر جمانا۔ تنہائی میں بیٹھ کر زور زور سے ہنسنا، مختلف قسم کے منتر کا جاپ کرنا۔ مثلاً دن میں ۳۰ بار زور زور سے یہ الفاظ کہنا: میں اس سے زیادہ ہوں جتنا میں دکھائی دیتا ہوں، دنیا کی تمام طاقت میرے اندر موجود ہے، میں منظم ہوں اور توانائی سے بھرا ہوا ہوں:

I am more than I appear to be. All the world's strength and power rest inside me. I am disciplined and energized.

یوگی رمن نے امریکی وکیل کو بتایا کہ اس قسم کی مختلف ذہنی اور نفسیاتی ورزشوں کے ذریعہ تم اپنے آپ کو اس حد تک تیار (conditioned) کر سکتے ہو کہ تم سلف ماسٹری (self mastery) کے درجے تک پہنچ جاؤ اور پھر تم وہ سب کچھ حاصل کر لو گے جو تم چاہتے ہو۔ صحت، جوانی، مسرت، کامیابی اور لمبی زندگی۔

تبصرہ

اس کتاب پر میں نے گہرائی کے ساتھ غور کیا مگر وہ مجھے ایک پر لطف کہانی کے سوا کچھ اور نظر نہ آئی۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ پچھلے ۵ ہزار سال سے بے شمار دانا لوگ (sages) روحانی ترقی کے اس فارمولا پر عمل کرتے رہے ہیں اور آج بھی وہ عمل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں پہلا سوال یہ ہے کہ مصنف کو اپنی بات پیش کرنے کے لئے کوئی حقیقی کردار کیوں نہ ملا۔ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے یوگی رمن کے نام سے ایک فرضی کردار تخلیق کیا اور اس کے حوالہ سے اپنا خیالی نظریہ مرتب کر ڈالا۔

دوسری بات یہ کہ مفروضہ یوگی رمن نے جو ٹکنیک امریکی وکیل کو بتائی وہ سب جسمانی نوعیت کی تھی اور جسمانی ورزش (physical exercise) سے روحانی نتیجہ (spiritual result) کبھی ممکن نہیں۔

تیسری بات یہ کہ مسرت (happiness) بذات خود کوئی منزل نہیں۔ یہ ایک حیوانی منزل ہو سکتی ہے مگر وہ کوئی انسانی منزل نہیں۔ اس لئے کہ پر مسرت زندگی بالفرض حاصل ہو سکے تب بھی وہ اس قیمت پر ہوگی کہ انسان کی بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں غیر استعمال شدہ رہ جائیں گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص

مقوی غذائیں کھا کر اپنے جسم کو فربہ بنالے مگر وہ دماغی بڑھوتری سے محروم ہو گیا ہو۔ انسان کی منزل با مقصد زندگی ہے نہ کہ صرف پرمسرت یا پرراحت زندگی۔

چوتھی بات یہ کہ ذہنی تناؤ کوئی برائی (evil) نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی تناؤ انسانی ترقی کے لئے ایک مہمیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچر نے انسان کی ترقی کے لئے شاک ٹریٹمنٹ کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ تمام بڑے انسان ہمیشہ ناموافق حالات میں بنے ہیں نہ کہ موافق حالات میں۔ موافق حالات یا پرسکون حالات احمقوں کی جنت (fool's paradise) تو وجود میں لاسکتے ہیں مگر وہ دانشمندوں کی دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتے۔

تخلیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانی وجود کے دو حصے ہیں ــــــــ جسم اور دماغ۔ دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ انسان کا جسم مادی غذا پر زندہ رہتا ہے۔ اچھی غذائیں اور صحت بخش ماحول اگر اسے حاصل ہو جائے تو جسم فربہ اور تندرست ہو جائے گا۔

لیکن جسم کی فربہی یا تندرستی کا کچھ بھی تعلق دماغ کے ارتقاء سے نہیں ہے۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دماغ (brain) بے شمار چھوٹے چھوٹے اجزاء (cells) کا مجموعہ ہے۔ یہ اجزاء پیدائشی طور پر خوابیدہ حالت میں ہوتے ہیں۔ ان کو متحرک کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ چیلنج ہے۔ زندگی سے مقابلہ کرتے ہوئے انسان کو مختلف قسم کے جو چیلنج پیش آتے ہیں وہی دماغی ذرّات کو متحرک کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مذکورہ کتاب نہ صرف ایک فرضی کہانی ہے بلکہ وہ سائنسی حقائق کے سراسر خلاف ہے۔ اس کتاب کی اسکیم اگر بالفرض وہ واقعہ بن سکے تو اس کے نتیجہ میں کچھ فربہ جسم تو ضرور دکھائی دیں گے لیکن ارتقاء یافتہ انسانی ذہن کا زمین سے خاتمہ ہو چکا ہوگا۔

نیوز ۲۴

بی بی سی لندن نے اپنے ٹی وی پر ایک نیا چینل شروع کیا ہے۔ اس کا نام نیوز ۲۴ (News-24) ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹہ چلے گا اور رات دن کے ہر لمحہ میں اہلِ برطانیہ کو خبریں فراہم کرتا رہے گا۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو اچانک میرے دماغ میں آیا کہ اسی قسم کا ایک زیادہ بڑا اہم وقتی چینل ہے جو نہ صرف رات دن چل رہا ہے بلکہ وہ کروڑوں سال سے جاری ہے۔ مزید یہ کہ وہ کسی ایک ملک کو خبریں دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ سارے عالم کو اور تمام انسانی نسلوں کو مسلسل خبریں دے رہا ہے۔

یہ کائناتی ٹی وی ہے جس کو خود کائنات کے خالق نے قائم کیا ہے۔ دنیا کی ہر چیز، پہاڑوں اور سمندروں سے لے کر درخت کے پتوں اور صحرا کے ذرّوں تک ہر چیز گویا اس کائناتی خبر رسانی کے نظام کا ٹی وی سیٹ ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں ہر لمحہ یہ پیغام دے رہی ہیں کہ یہ کائنات کس لیے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور انسان کا مستقبل آخر کار کس چیز سے وابستہ ہے۔ پہاڑ اور درخت جیسی چیزیں اگر خاموش زبان میں یہ خبریں دے رہی ہیں تو سمندر کی موجیں اور چڑیوں کے چہچہے اس خبر کو بلند آواز میں نشر کر رہے ہیں۔

انسان کی تخلیق اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ وہ اس عالمی خبر رسانی سے بھرپور استفادہ کر سکے۔ انسان کو آنکھیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ اس خدائی ٹی وی کے مناظر کو دیکھے۔ انسان کو جو کان دیے گئے ہیں وہ اسی لیے ہیں کہ وہ اس نشریاتی نظام کی آواز سنے۔ انسان کو دماغ اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس مشاہدہ اور سماعت کا تجزیہ کر کے ان سے سبق حاصل کرے۔ انسان کو دل اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ان ربانی خبروں پر تڑپے۔ انسان کو ہاتھ اور پاؤں اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ ان خبروں کے مطابق ہمہ تن متحرک ہو جائے۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو خدائی خبر رسانی کے اس عالمی نظام سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنالیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو اس رہنمائی کو لینے میں ناکام رہیں۔ ایسے لوگ گویا کہ اندھے اور بہرے ہیں۔ وہ مستقبل کی ابدی زندگی میں بھی اندھے اور بہرے بنے رہیں گے۔

معذوری کے باوجود

جولائی ۲۰۰۱ میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے میں نے سوئزرلینڈ کا سفر کیا۔ یہاں میری ملاقات ملیشیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ ان کا نام ڈاکٹر چندر مظفر (پیدائش ۱۹۴۷) ہے۔ وہ سیلنگور میں رہتے ہیں (Tel. 603-62019170)

ان کو بچپن میں پولیو ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ مستقل طور پر دونوں پیروں سے معذور ہو گئے۔ اب وہ وہیل چیئر پر رہتے ہیں۔ اس معذوری کے باوجود انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگریزی زبان میں وہ لکھنے اور بولنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اپنی معذوری کے باوجود وہ ایک بھرپور زندگی گذارتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے لیے ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا خدا پر عقیدہ تھا جس نے مجھے اپنی جسمانی معذوری پر قابو پانے کے لائق بنایا:

I would like to think that it is my faith in God, which enabled me to overcome my physical handicap.

خدا پر عقیدہ انسان کو باحوصلہ بناتا ہے۔ جب بھی اس پر کوئی مشکل پیش آتی ہے تو اس کا یہ یقین اس کے لیے سہارا بن جاتا ہے کہ میں نے جس ہستی کو اپنا خدا بنایا ہے وہ ہر چیز سے اوپر ہے۔ وہ تمام طاقتوں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس طرح خدا کا عقیدہ اس کو ہر بار نیا عزم دیتا ہے۔ وہ نئے حوصلہ کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ خدا کی توفیق سے کامیاب ہو جاتا ہے۔

انسان کے اندر فطری طور پر اتنے زیادہ امکانات رکھے گئے ہیں جو حادثات سے کبھی ختم نہ ہوں۔ ہر حادثہ کے بعد انسان کے لئے ایک نیا موقع باقی رہتا ہے۔ ہر حادثہ کے بعد یہ ممکن رہتا ہے کہ آدمی بقیہ امکانات کو استعمال کر کے ازسرِ نو اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ایک شاخ ٹوٹنے کے بعد وہ دوسری شاخ پر اپنا آشیانہ بنا لے۔

چشمہ کا سبق

۱۹۸۹ کے وسط میں میں نے کشمیر کا ایک سفر کیا۔ ایک روز میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سرینگر شہر کے باہر گیا۔ ہم لوگ ایک کھلی وادی میں تھے۔ سامنے پہاڑی سلسلے دکھائی دیتے تھے۔ ان پہاڑوں سے نکلنے والے چشمے میدان میں ہر طرف بہہ رہے تھے۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہ دیکھئے یہ سیکڑوں چشمے جو یہاں بہہ رہے ہیں، وہ فطرت کی زبان میں آپ کو ایک بے حد اہم پیغام دے رہے ہیں۔ وہ پیغام یہ ہے کہ ٹکراؤ سے اعراض کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔

پھر میں نے کہا کہ ان بہتے ہوئے چشموں کے راستہ میں جگہ جگہ پتھر موجود ہیں۔ یہ پتھر بظاہر ان کے راستہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر یہ چشمے ایسا کریں کہ وہ پتھر کو توڑ کر سیدھ میں آگے جانا چاہیں تو ان کا سفر اچانک رک جائے گا۔ ان چشموں نے اس مسئلہ کا یہ فطری حل نکالا ہے کہ وہ پتھر کے دائیں یا بائیں مڑ کر آگے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا راستہ ایک لمحہ رکے بغیر جاری رہتا ہے۔

یہ اہل کشمیر کے لئے فطرت کا ایک عظیم سبق ہے۔ آپ لوگوں کو چاہئے کہ سیاسی چٹانوں سے ٹکرانے کا ذہن ختم کر دیں اور ان سیاسی چٹانوں کی موجودگی میں جو مواقع آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں ان کو استعمال کریں۔

یہی انسان کے لئے اس دنیا میں کامیاب سفر کا واحد طریقہ ہے۔ جس طرح بہتے ہوئے چشمہ کے راستہ میں پتھر ہوتے ہیں اسی طرح ہر فرد اور ہر گروہ کے راستہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں موجود ہوتی ہیں۔ عقل مندی یہ ہے کہ آدمی پیش آنے والی رکاوٹوں سے نہ ٹکرائے، وہ رکاوٹوں سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفر مسلسل جاری رکھے۔ رکاوٹوں سے ٹکرانا سفر کو روک دینے کے ہم معنٰی ہے۔ اس کے برعکس رکاوٹوں سے اعراض کرنا بلا توقف اپنے سفر کے لئے مواقع حاصل کرنا ہے۔

یہ اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون ہے۔ اس قانون سے لڑنا خود فطرت کے نظام سے لڑنا ہے، اور کون ہے جو فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو سکے۔

تعلیم و تربیت

اگست ۱۹۴۵ میں جاپان مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ اس نے سیاسی آزادی بھی کھودی اور معاشی استقلال بھی۔ اس کے بعد جاپان نے یہ کیا کہ سیاسی آزادی کے مسئلہ کو چھیڑے بغیر معاشی استقلال کے لیے جدوجہد شروع کردی، اس طریق کار کے ذریعہ جاپان نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ آج وہ سپر اقتصادی طاقت شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۰ تک جاپان دنیا کو ۵ کھرب ڈالر قرض کے طور پر دے چکا تھا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۹۵ تک جاپان کے عالمی قرضہ کی مقدار ۱۰ کھرب ڈالر ہو چکی ہوگی۔ جاپان ۱۹۴۵ میں امریکہ کا سیاسی محکوم تھا، آج جاپان نے خود امریکہ کو اپنا اقتصادی مقروض بنالیا ہے۔

پاکستان کے ایک کالم نویس مسٹر ابوذر غفاری مئی ۱۹۹۲ میں کابل گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک جاپانی صحافی سے ہوئی، انھوں نے جاپانی صحافی سے پوچھا کہ جاپان کی اس حیران کن ترقی کا راز کیا ہے۔ کس طرح ایسا ہوا کہ جاپان نے ایک ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

جاپانی صحافی نے جواب دیا کہ جاپان کی اعلیٰ ترقی کا راز جاپانی قوم کے اعلیٰ کردار میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس قدرتی وسائل نہیں۔ اس لیے ہم اپنے بچوں ہی کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جاپان کا ایک ایک گھر گویا جاپانی بچہ کی تربیت گاہ ہے۔ جاپان کے لوگ اپنے بہترین وسائل اپنے بچہ کی تعلیم پر صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ جاپانی قوم اس وقت مکمل طور پر ایک تعلیم یافتہ قوم ہے۔ ہمارے یہاں جہالت کا کوئی وجود نہیں۔ جاپان میں اتنے زیادہ سائنسی تعلیم یافتہ لوگ ہیں کہ آپ جاپان کو ایک سائنسی قوم کہہ سکتے ہیں۔

اس تعلیم و تربیت نے جاپان کے لوگوں میں اعلیٰ ترین قومی کیرکٹر پیدا کر دیا ہے، مثلاً جاپانی قوم انتہائی محب وطن قوم ہے۔ اگر قوم کا ایک روپیہ کا نقصان ہو رہا ہو تو ایک جاپانی اپنی قوم کو ایک روپیہ کے نقصان سے بچانے کے لیے اپنا سو روپیہ کا نقصان کروا لینے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھے گا۔ (نوائے وقت، لاہور، ۱۲ جولائی ۱۹۹۲)

جاپان نے حریف سے ٹکراؤ کو چھوڑا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے یہاں اعلیٰ سائنسی معاشرہ وجود میں لا سکے۔ یہی دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد راستہ ہے۔

بچّوں کی تربیت

ایک صاحب کو ان کے پڑوسی نے نہایت سخت بات کہہ دی۔ وہ صاحب اس کو سن کر چپ چاپ اپنے گھر میں چلے آئے۔ انھوں نے کہنے والے کو کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے لڑکے کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت بگڑا۔ اس نے کہا کہ اس شخص کی کیسے ہمت ہوئی کہ وہ میرے باپ کو اس طرح ذلیل کرے۔ میں اس کو سبق دوں گا تاکہ آئندہ وہ کبھی ایسی ہمت نہ کرے۔

باپ نے بیٹے کو ٹھنڈا کیا۔ باپ نے کہا کہ آخر اس نے ایک لفظ ہی تو کہا ہے۔ اس نے مجھے کوئی پتھر تو نہیں مارا۔ پھر اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ اس نے اگر اپنی زبان خراب کی ہے تو ہم اپنی زبان کیوں خراب کریں۔ باپ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اس کو بھلا دو اور اپنے کام میں لگ جاؤ۔

بیٹا اس واقعہ کو " یاد " کے خانہ میں رکھنا چاہتا تھا، باپ نے اس کو " بھول " کے خانہ میں ڈال دیا۔ جو واقعہ عام حالات میں غصہ اور انتقام کا موضوع بنتا، وہ صبر اور برداشت کا موضوع بن گیا۔ کچھ دنوں بعد خود پڑوسی کو شرمندگی ہوئی۔ اس نے آکر اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور آئندہ کے لیے پہلے سے زیادہ بہتر ہو گیا۔

باپ اگر اپنے بیٹے کے اندر انتقام کی نفسیات ابھارتا تو وہ برائی کا ایجنٹ بن جاتا۔ مگر باپ نے جب اپنے بیٹے کو بھلانے اور برداشت کرنے کے راستہ پر ڈالا تو وہ ان کے لیے نیکی اور سچائی کا رہنما ہو گیا۔ قرآن کے لفظوں میں وہ متقیوں کا امام بن گیا (الفرقان ۷۴)

اسی کا نام بچّوں کی تربیت ہے۔ بچّوں کی تربیت یہ نہیں ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے انھیں بٹھایا جائے اور تحریر یا تقریر کی صورت میں انھیں اصلاحی باتیں سنائی جائیں۔ اصل تربیت یہ ہے کہ گھر کے اندر جب عملی طور پر وہ مواقع پیدا ہوں جہاں ایک راستہ صحیح سمت میں جاتا ہو اور دوسرا راستہ غلط سمت میں۔ ایسے مواقع پر جذبات کو برداشت کر کے اور ذاتی نقصان اٹھا کر گھر والوں کو رہنمائی دی جائے۔ ان کے ذہن کو ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف پھیر دیا جائے۔

تربیت پیدا شدہ حالات کے درمیان رہنمائی کے ذریعہ کی جاتی ہے نہ کہ مجرد قسم کی وعظ خوانی کے ذریعہ۔

اعتراف اور بے اعترافی

گلبرٹ کیتھ چسٹرٹن (G.K. Chesterton) ایک انگریز مصنف ہے۔ وہ ۱۸۷۴ میں لندن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول ہے کہ لوگ اکثر جھگڑتے ہیں کیوں کہ وہ اپنی بات کو دلیل سے ثابت نہیں کر پاتے :

People generally quarrel because they cannot argue.

دو آدمیوں کے درمیان کسی اختلافی موضوع پر بات ہو رہی ہو۔ اس کے بعد ان میں سے ایک آدمی تیز تیز بولنے لگے یا الزام تراشی کی زبان استعمال کرنا شروع کر دے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ دلیل کے میدان میں اپنے کو کمزور پا رہا ہے اور دلیل کی کمی کو الفاظ کی زیادتی سے پورا کرنا چاہتا ہے۔ گفتگو میں جھگڑنا خود اپنی کمزوری کا ثبوت ہے نہ کہ فریق ثانی کی کمزوری کا۔

دلیل غصہ سے زیادہ طاقت ور ہے، جس طرح بم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔ جس آدمی کے پاس زیادہ طاقت کا ہتھیار ہو وہ کبھی کم طاقت کا ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح جس آدمی کے پاس دلیل کا زور ہو وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کبھی غصہ کا زور نہیں دکھائے گا۔ دلیل کی زمین پر کھڑا ہونے کا احساس آدمی کے اندر پُر اعتماد سنجیدگی پیدا کرتا ہے، اور دھاندلی کی زمین پر کھڑا ہونے کا احساس جھنجلاہٹ اور بے یقینی۔

جب دو آدمیوں کے درمیان کسی موضوع پر گفتگو ہو۔ اور دلائل کے سامنے آنے کے بعد یہ ظاہر ہو کہ ایک آدمی کا نقطہ نظر صحیح تھا اور دوسرے آدمی کا نقطۂ نظر غلط، تو اس کے بعد دوسرا آدمی کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ اپنی غلطی مان لینے کے بجائے طیش میں آجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اعترافِ حق کی عظمت کو نہیں جانتا۔ وہ اپنی عظمت سے واقف ہے مگر وہ حق کی عظمت سے واقف نہیں۔

آج ہر آدمی لذتِ بے اعترافی میں جی رہا ہے۔ کسی کو بھی لذتِ اعتراف کی کیفیت معلوم نہیں۔

نکتہ آفرینی

ایک صاحب نے کالج کے یونین ہال میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان عربی سے ماخوذ ہے۔ انگریزی کے تمام الفاظ عربی زبان سے سرقہ کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔ ایک طالب علم کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ آپ تو بڑی عجیب بات کہہ رہے ہیں۔

مقرر نے کہا کہ آپ کو تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تجربہ کر لیجئے۔ آپ کوئی بھی انگریزی کا لفظ بولئے۔ میں بتا دوں گا کہ وہ عربی کے کس لفظ کو لے کر بنایا گیا ہے۔ طالب علم نے کچھ دیر تک سوچا۔ پھر بولا کہ اچھا بتائیے، بلائنڈ (blind) کا لفظ کس عربی لفظ سے بنا ہے۔ مقرر نے فوراً کہا : بلا عین۔

اس کے بعد ایک اور مقرر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انگریزی کے تمام لفظ اردو سے لیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان پوری کی پوری اردو زبان پر مبنی ہے۔ دوبارہ ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ کا یہ دعویٰ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ مقرر نے کہا کہ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ آپ انگریزی کا کوئی لفظ بولیں۔ میں فوراً بتا دوں گا کہ وہ کس اردو لفظ سے ماخوذ ہے۔ آدمی نے سوچ کر کہا کہ ڈیکوریشن (decoration) کس اردو لفظ سے بنا ہے۔ مقرر نے فوراً جواب دیا : دیکھو رے شان۔

پھر تیسرے صاحب اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان ساری کی ساری ہندی زبان کے الفاظ لے کر بنائی گئی ہے۔ دوبارہ حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ مقرر نے کہا کہ آپ انگریزی کا کوئی لفظ بولئے۔ پھر میں بتاؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ لو (love) کس ہندی لفظ سے بنا ہے۔ مقرر نے فوراً کہا "لوبھ"

اس قسم کی باتیں استدلال نہیں، وہ نکتہ آفرینی ہیں۔ اس طرح کے نکتوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ ثبوت کا تعلق حقائق واقعی سے ہے نہ کہ نکتوں اور لطیفوں سے۔

دانش مند وہ ہے جو دلیل اور لطیفہ کے فرق کو سمجھے۔ وہ دلیل والی بات کو اپنائے اور جو بات محض لطیفہ ہو اس سے اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔

مایوسی نہیں

ایک نوجوان اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ میں دو مرتبہ لگاتار انجینئرنگ کا مپٹیشن میں بیٹھا مگر دونوں بار ناکام رہا۔ اس کے بعد مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں ہر وقت فکر مند رہنے لگا۔ یہاں تک کہ ذہنی طور پر بھی میں کمزور ہو گیا۔ پچھلے سال اتفاقاً الرسالہ (اردو) میری نظر سے گزرا۔ اس کے اندر مجھے نئی روشنی معلوم ہوئی۔ میں الرسالہ کا مستقل قاری بن گیا۔ خدا کے فضل سے اب میں اپنے اندر حوصلہ اور ہمت اور محنت کرنے کا جذبہ پا رہا ہوں (اشتیاق احمد)

زندگی میں ہر شخص کو ناکامی کے تجربات پیش آتے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس قسم کے ناخوش گوار تجربات کو خارجی تعصب کے خانہ میں ڈال کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ موجودہ حالات میں میرے لئے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں۔ ترقی صرف کچھ خوش قسمت لوگوں کا مقدر ہے، وہ میرا مقدر نہیں۔

یہ سوچ سراسر غلط ہے۔ کوئی بھی خارجی سبب کبھی کسی آدمی کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ آدمی جب بھی ناکام ہوتا ہے یا اس کی ترقی رکتی ہے تو اس کا سبب خود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے خود اپنے آپ پر توجہ دے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محنت کی کمی آدمی کو پیچھے ڈھکیل دیتی ہے۔ کبھی آدمی اپنی صلاحیت کے خلاف اپنے لئے غیر موزوں کام کا انتخاب کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک بار کی کوشش کو آخری کوشش سمجھ لیتا ہے، حالانکہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ بار بار کوشش کی جائے۔

اس طرح کی مختلف داخلی کوتاہیاں آدمی کو ناکامی سے دوچار کرتی ہیں۔ مگر آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر ناکامی کو وقتی سمجھے۔ وہ اس کو آخری واقعہ کے بجائے درمیانی واقعہ قرار دے۔ وہ اپنی ساری سوچ خود اپنی کوتاہی کو دریافت کرنے میں لگا دے۔ اپنی کوتاہی سے بے خبری آدمی کو پست کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ اور اپنی کوتاہی سے باخبری عمل کا جذبہ ابھار کر آدمی کو کامیابی کی منزل پر پہنچا دیتی ہے۔

جاننے کی بات

ایک انگریز نے ایک مرتبہ مجھ سے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۷۳ کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے انگلینڈ سے سوئزرلینڈ جانا تھا۔ وہاں زیورک میں میری بہن رہتی تھی، اس سے مجھے ملنا تھا۔ یہ سفر میں نے کار کے ذریعہ کیا۔ میں لندن سے روانہ ہوا اور اپنی گاڑی چلاتا ہوا سوئزرلینڈ میں داخل ہو گیا۔ انگلینڈ میں بائیں چلو(keep left) کا اصول ہے، اور سوئزرلینڈ میں دائیں چلو(keep right) کا اصول۔ میں زیورک (سوئیزرلینڈ) میں داخل ہوا تو مجھے یاد نہ رہا کہ اب میں نئے ملک میں ہوں، اور اس ملک کے اصول کے مطابق یہاں مجھے اپنی گاڑی سڑک کے دائیں طرف چلانا چاہئے۔ اپنی پچھلی عادت کے زیر اثر میں سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگا۔

ابھی کسی حادثہ کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ٹریفک کانسٹبل نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے ویسل دے کر مجھے روکا۔ میرے قریب آکر اس نے میری گاڑی کی پلیٹ دیکھی، میرا حلیہ دیکھا۔ اپنے تجربہ کی بنا پر وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے جان لیا کہ یہ ایک انگلش آدمی ہے اور انگلش ہونے کی بنا پر سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑا رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے معنیٰ خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ تم کو جاننا چاہئے کہ اس وقت تم انگلینڈ میں نہیں ہو۔ اس وقت تم سوئیزرلینڈ میں ہو: You are not (in England now.)

انسانی انتظام کے اعتبار سے انگلینڈ اور سوئیزرلینڈ میں فرق ہے۔ مگر ایک اور پہلو سے ساری دنیا کا معاملہ ایک ہے۔ وہ یہ کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ یہاں خدا کا قانون ہی واحد قانون ہے جو کسی آدمی کے لئے نجات اور کامیابی کا ضامن ہے۔

مگر ہر آدمی اس حقیقت سے بے خبر ہو کر اپنی زندگی کی گاڑی اپنی پسند کے رخ پر دوڑا رہا ہے۔ دنیا میں ہر قدم پر خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے ہیں جو خاموش زبان میں کہہ رہے ہیں کہ اے انسان، تو اپنی دنیا میں نہیں ہے، تو خدا کی دنیا میں ہے۔ جو شخص اس آواز کو سن کر اپنا رخ درست کر لے وہ کامیاب ہے، اور جو شخص اس آواز کو نہ سنے، اس کے لئے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

سچائی کی طاقت

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۷ فروری ۲۰۰۰ میں لکھتے ہیں: مراد آباد میں ہماری ایک پرچون کی دکان (General Store) ہے۔ ہم دکان پر اخبار اور کاپی کی رڈی بھی خریدتے ہیں۔ ایک بار 'الرسالہ' کے کچھ پرانے شمارے مجھے رڈی میں ملے اور میں انھیں گھر لے آیا۔ جب ان کو پڑھ کر دیکھا تو مجھے آپ کے مضامین بہت اچھے لگے۔ پھر میں نے حریم بک ہاؤس (جو کہ محلہ مغلپورہ مراد آباد میں واقع ہے) سے اکتوبر ۱۹۹۸ کا الرسالہ لیا اور اس کے بعد جنوری ۱۹۹۹ سے ہر مہینہ کا الرسالہ لے کر پڑھتا ہوں۔ الرسالہ کو میں ایک نصیحت نامہ سمجھتا ہوں۔ (ارشد علی، محلہ پیرزادہ، مراد آباد)

یہ چھوٹا سا واقعہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ سچائی اپنے اندر لامحدود طاقت رکھتی ہے۔ سچائی ایک ایسا سیلاب ہے جس کو روکنا کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں۔

سچائی کو اگر کوئی شخص ناقدری کرتے ہوئے اسے "رڈی" میں فروخت کردے تب بھی اس کا یہ فعل سچائی کو اس کے قدرداں تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔ سچائی کے خلاف اگر کوئی پروپیگنڈے کی مہم چلائے تو اس قسم کی مہم صرف سچائی کی اشاعت میں اضافہ کرے گی۔ سچائی کو اگر کوئی شخص اس کے وطن سے نکال دے تو عملاً صرف یہ ہوگا کہ سچائی ملکی دائرے سے نکل کر بین اقوامی دائرہ میں داخل ہو جائے۔ غرض سچائی کے خلاف ہر کارروائی سچائی کے حق میں ایک نیا دروازہ کھولنے کے ہم معنی ثابت ہوگی۔

سچائی اپنے آپ میں طاقت ہے۔ سچائی جب بھی کھڑی ہوتی ہے فطرت کے تمام قوانین اس کی حمایت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے تمام عوامل اس کے حق میں جمع ہونے لگتے ہیں۔ سچائی ایک ایسی ابدی حقیقت ہے، جو مغلوب ہو کر بھی غالب رہتی ہے۔ سچائی اگر بظاہر خاکستر دکھائی دے تب بھی اس کے اندر ایک ایسا شعلہ موجود رہتا ہے جو بھڑک کر ساری دنیا کو روشن کردے۔

ذاتی نمائش

ایک مسلمان کمانے کے لیے باہر گیے۔ وہ تعلیم یافتہ تو نہ تھے، تاہم باہر انھیں کوئی اچھا کام مل گیا۔ انھوں نے کافی پیسہ کمایا۔ وہ عید کے موقع پر گھر آئے تو انھوں نے مجھے بھی خصوصی طور پر اپنے یہاں عید کے دن آنے کی دعوت دی۔ میں گیا۔ سوئیاں لائی گئیں۔ میں نے دیکھا تو اس کے اوپر سونے کا ورق لگا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس طرح تو چاندی کا ورق لگانا بھی بے کار ہے۔ پھر انھوں نے سونے کا ورق کیوں لگا دیا ہے۔ آخر کار سمجھ میں آیا کہ اس کے پیچھے ذاتی نمائش کا جذبہ تھا۔ چاندی کے ورق کے عمومی استعمال کی وجہ سے اس کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ اس لیے انھوں نے سونے کا ورق لگایا تاکہ ذاتی نمود ونمائش کا مقصد پورے طور پر حاصل ہو۔

ذاتی نمائش کا جذبہ آدمی کا سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ ہے۔ یہ جذبہ جاہلوں کے اندر بھی ہے اور عالموں کے اندر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاہلوں کا جذبہ کثیف انداز میں ظاہر ہوتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کا جذبہ لطیف انداز میں۔

ذاتی نمائش کا جذبہ بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ حتی کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ میں سونے اور چاندی کے سکوں میں بکنے والا نہیں، مگر عین اسی وقت وہ نمود ونمائش اور شہرت وعزت کے سکوں میں بکا ہوا ہوتا ہے۔ آدمی بظاہر خاکساری کا مظاہرہ کرتا ہے، مگر اس کی خاکساری صرف اظہار خویش کی بدلی ہوئی صورت ہوتی ہے۔ حتی کہ وہ عبادت کرتا ہے۔ وہ مال خرچ کرتا ہے۔ وہ لڑکر اپنی جان دیدیتا ہے مگر ان سب کے پیچھے بھی حقیقۃً ذاتی نمائش کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اللہ تعالی کے یہاں ساری اہمیت صرف نیت کی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ آخری حد تک اپنی نیت کو پاک رکھنے کی کوشش کرے۔ جو کچھ کرے صرف اللہ کے لیے کرے۔ جب بھی کسی عمل کے دوران اس کے اندر ذاتی نمائش کا جذبہ آجائے تو وہ اس کو شیطان کا وسوسہ سمجھتے ہوئے اللہ سے استغفار کرے۔ یہی نجات کا واحد راستہ ہے۔

توجیہہ یا بددیانتی

دہلی کے انگریزی اخبار پانیر (۱۷ستمبر ۱۹۹۹) میں صفحہ اول پر ایک رپورٹ چھپی۔ اس کے مطابق، ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر وی این نرائنن (V. N. Narayanan) کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس کے کالم میوز نگس (Musings) میں چھپا، وہ ایک ادبی سرقہ (Plagiarism) تھا۔ یہ ایک مغربی مصنف برائن ایپل یارڈ (Bryan Appleyard) کا مضمون تھا جس کو مسٹر نرائنن نے اپنے نام کے تحت لفظ بلفظ (verbatim) شائع کر دیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد جب اس ادبی سرقہ کا چرچا ہوا تو مسٹر نرائنن نے ہندستان ٹائمس کی ادارت سے ضمیر کی بنیاد (conscience ground) پر استعفیٰ دے دیا۔ تاہم انھوں نے اپنے اس فعل کی توجیہہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ: میں خیالات کا ناقل ہوں اور جب میں کسی خیال کو کسی سے لفظ بلفظ لیتا ہوں تو میں ذاتی طور پر اس آدمی کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہوتا ہوں۔ میں مصنف کو اپنی ذات میں شامل کر لیتا ہوں۔ جب ایک خیال میڈیا میں آجائے تو وہ عوامی ملکیت بن جاتا ہے:

> I am a carrier of ideas and when I take an idea verbatim from someone, I am personally paying homage to the person who has expressed it. I personalise the author, I get into the person. Once an idea is expressed in the media it is public property.

یہ بلاشبہہ ایک جھوٹی توجیہہ ہے۔ اس دنیا میں غلطی کرنا صرف غلطی ہے۔ مگر غلطی کے بعد اس کی جھوٹی توجیہہ پیش کرنا بددیانتی۔ غلطی قابل معافی ہو سکتی ہے مگر بددیانتی (dishonesty) ہرگز قابل معافی نہیں۔

اصل سبب جہالت

۲۷ فروری ۲۰۰۲ء کو مغربی ہندستان کے گودھرا ریلوے اسٹیشن پر ایک واقعہ ہوا۔ کچھ لوگوں نے مشتعل ہو کر ٹرین کے ایک ڈبہ میں آگ لگادی جس میں تقریباً ساٹھ ہندو مسافر جل کر مر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آگ لگانے والے لوگ مسلمان تھے۔ اُس کے بعد مارچ ۲۰۰۲ء میں گجرات کے مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ فساد بھڑک اُٹھا۔ اس فساد میں تقریباً ایک ہزار مسلمان مار ڈالے گئے اور اُن کے بہت سے گھروں اور دکانوں کو آگ لگادی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ گجرات میں اس فساد کو کرنے والے لوگ ہندو تھے۔

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ دونوں واقعات کو کرنے والا ایک ہی مشترک گروہ تھا، اور وہ ہے جاہل اور بے پڑھے لکھے لوگوں کی بھیڑ۔ گودھرا ریلوے اسٹیشن پر جن لوگوں نے ٹرین کے ڈبہ میں آگ لگائی وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے، نہ کہ مسلمان۔ اسی طرح ریاست گجرات میں جن لوگوں نے جگہ جگہ خونی فساد کیا وہ بھی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے، نہ کہ ہندو۔ یہ لوگ اگر تعلیم یافتہ ہوتے تو ایسا واقعہ کبھی پیش نہ آتا۔

تعلیم یافتہ انسان اور غیر تعلیم یافتہ انسان میں کیا فرق ہے۔ وہ شعور اور بے شعوری کا فرق ہے۔ غیر تعلیم یافتہ انسان اپنے ناپختہ شعور کی بنا پر صرف اپنے جذبات کو جانتا ہے۔ اس کے برعکس تعلیم یافتہ انسان اپنے پختہ شعور کی بنا پر اپنے جذبات کے ساتھ اُس کے نتائج (consequences) کو بھی جانتا ہے۔

اسی فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ غیر تعلیم یافتہ انسان کے جذبات کو اگر ٹھیس لگتی ہے تو وہ بھڑک کر متشددانہ کارروائی کرنا شروع کر دیتا ہے، خواہ اُس کا نتیجہ زیادہ بڑے نقصان کی صورت میں خود اُس کو بھگتنا پڑے۔ اس کے برعکس اگر تعلیم یافتہ انسان کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ حکمت اور تحمل سے کام لیتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی شعوری بیداری کی بنا پر زندگی کی اس عالمگیر حقیقت کو جانتا ہے کہ —— چھوٹے

نقصان کو برداشت کرلو تاکہ تمھیں بڑے نقصان کو برداشت نہ کرنا پڑے۔

ایک بڑے شہر کے ریلوے پلیٹ فارم پر دو تعلیم یافتہ آدمی آگے پیچھے چل رہے تھے۔ پیچھے والے مسافر کے ہاتھ میں ایک بڑا بیگ تھا۔ اُس نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا۔ اس کوشش میں اُس کا بیگ اگلے آدمی سے ٹکرا گیا۔ اگلا آدمی اچانک پلیٹ فارم پر گر پڑا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ صرف یہ تھا کہ پیچھے والے نے معذرت کے انداز میں کہا کہ ساری (sorry)۔ اس کے بعد آگے والے نے نرمی کے ساتھ کہا کہ اوکے (okay) اور پھر دونوں خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

اس کے برعکس اگر یہ دونوں مسافر جاہل اور بے شعور ہوتے تو دونوں غصہ ہو جاتے۔ ایک کہتا کہ تم اندھے ہو۔ دوسرا کہتا کہ تم پاگل ہو۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے لڑ جاتے، خواہ اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہو کہ دونوں کی ٹرین چھوٹ جائے، اور وہ اپنی منزل پر پہنچنے کے بجائے اسپتال میں داخل کردیئے جائیں۔

اصلاح کا حقیقی طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ خرابی کی جڑ کہاں ہے۔ اس قسم کے تمام جھگڑوں کی جڑ جہالت ہے۔ اس لیے اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں میں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ پورے ملک کو مکمل طور پر تعلیم یافتہ بنا دیا جائے۔ یہی مسئلہ کی اصل جڑ ہے اور اس جڑ کو ختم کر کے فساد کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

ایک حالیہ سروے میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان کی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ریاست کیرلا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کیرلا میں جھگڑے اور فساد جیسے واقعات پیش نہیں آتے۔ اسی ملکی تجربہ میں مسئلہ کا حل چھپا ہوا ہے — لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایئے، اور اس کے بعد فرقہ وارانہ جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

جارج برنارڈ شا نے کہا تھا کہ جس آدمی کے پاس بھلا دینے کے لیے کچھ نہیں وہی سب سے زیادہ غیر تعلیم یافتہ انسان ہے۔ مستقبل کی تعمیر صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ پچھلی باتوں کو بھلا دیا جائے، اور بھلانے کی یہ حکمت صرف وہی لوگ جانتے ہیں جن کو ان کی تعلیم نے باشعور بنا دیا ہو۔

بے خبری

ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک وہ اس پر بولتے رہے کہ ہندستان میں مسلمان مسائل سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کو تعصب اور زیادتی کا سامنا ہے۔ ان کے لئے ترقی کے دروازے بند ہیں۔ آخر میں ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ وہ راجستھان میں ایک بزنس کررہے ہیں۔ اور پچھلے دو سال کے عرصہ میں انہوں نے اطمینان بخش کامیابی حاصل کی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ جو کاروبار وہ کررہے ہیں اس میں ان کا سابقہ ۹۹ فیصد غیر مسلموں سے پڑتا ہے۔ یہ غیر مسلم ان کے لئے نہایت مددگار (helpful) ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میں نے کہا کہ آپ کی سوچ میں ایک تضاد ہے۔ اور یہی تضاد آپ کو اصل معاملہ سمجھنے نہیں دیتا۔ آپ اس تضاد کے خول سے باہر آجائیں تو آپ خود بخود جان لیں گے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ماشاء اللہ ایک مسلمان ہیں۔ آپ نے یہاں ایک کاروبار شروع کیا۔ خود آپ کے بیان کے مطابق اسی ہندستان میں آپ کا کاروبار ترقی کررہا ہے۔ غیر مسلموں کی طرف سے آپ کو کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ ذاتی طور پر اس مثبت تجربہ کے باوجود کیوں آپ ایسا کہہ رہے ہیں کہ اس ملک میں مسلمان سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں بعض اردو اخبارات کی رپورٹوں اور بعض مسلم رہنماؤں کے بیانات کا حوالہ دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ تعصب اور زیادتی کے نظریہ کی اصل جڑ کیا ہے۔ یہ جڑ ملک کے اپنے حالات میں نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں کی زرد صحافت اور زرد قیادت اس کی ذمہ دار ہے۔ اگر ہمارے درمیان یہ زرد صحافت اور یہ زرد قیادت نہ ہو تو اس معاملہ کو جاننے کے لئے مسلمانوں کے پاس ان کا ذاتی تجربہ ہوگا اور پھر وہ یقینی طور پر جان لیں گے کہ ان کے وطن میں ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔

افغانستان کا سبق

نپولین بونا پارٹ نے کہا تھا کہ مجھے ایک لاکھ افغانی جوان مل جائیں تو میں ساری دنیا کو فتح کر ڈالوں۔ مگر آج انھی افغانی جوانوں نے بالکل برعکس کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کو تباہ کیا بلکہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو رسوا کرنے کا سبب بن گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں افغانوں کے ذریعہ مسلم دنیا کو جس المناک صورت حال کا تجربہ پیش آیا ہے وہ پچھلے چودہ سو سال میں انھیں کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ اس کا راز کیا ہے۔ اس المیہ کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے ان نااہل رہنماؤں پر ہے جنھوں نے افغانیوں کو جوش کی غذا تو دی مگر وہ انھیں ہوش کی خوراک نہ دے سکے۔ انھوں نے افغانیوں کو جہاد پر اکسایا مگر وہ ان کے اندر صبر کی اسپرٹ پیدا نہ کر سکے۔ جب کہ شریعت اور عقل دونوں بتاتے ہیں کہ جہاد صرف اس وقت تعمیر بنتا ہے جب کہ اس کے ساتھ صبر شامل ہو۔ صبر کے بغیر جہاد صرف تخریب ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

افغانستان کی جدید نسل جن مسلم رہنماؤں سے خاص طور پر متاثر ہوئی، ان کے نام یہ ہیں ـــــ سید جمال الدین افغانی، ڈاکٹر محمد اقبال، سید قطب، آیت اللہ خمینی، ابوالاعلی مودودی، اور آخر میں ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن۔ ان تمام رہنماؤں کی مشترک کمی یہ تھی کہ وہ سب کے سب اپنے زمانہ کے منفی حالات کے ردعمل کے طور پر ابھرے۔ ان میں سے ہر ایک کی سوچ ردعمل کی نفسیات کے تحت بنی، نہ کہ مثبت فکر کے تحت۔ ان کی نفسیات کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے جہاد اور اقدام کی اہمیت کو تو سمجھا مگر وہ صبر اور مصالحت کی اہمیت کو دریافت نہ کر سکے۔ ان مسلم مفکرین نے اپنے اس ذہن کو افغان کی نئی نسلوں کی طرف انڈیل دیا۔ اسی نااہل رہنمائی کا نتیجہ وہ بربادی ہے جو اکیسویں صدی میں حالیہ واقعات کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

اس انتہا پسندانہ ذہن کا نتیجہ یہ تھا کہ افغانیوں نے لڑائی اور تشدد کو خیر مطلق کا درجہ دے دیا۔ انھوں نے اس حقیقت کو نہیں جانا کہ روسی حملہ آوروں سے تو انھیں لڑنا ہے مگر جب روسی افغانستان سے

واپس چلے جائیں تو انہیں اپنے ہم مذہبوں سے نہیں لڑنا ہے، خواہ ان کے ایک گروپ کو یکطرفہ طور پر اپنی بندوقوں کو ناکارہ کر دینا پڑے۔ انہیں باہمی اختلاف کو امن کے دائرہ میں رکھ کر حل کرنا ہے، اختلاف کو کسی بھی حال میں تشدد کے مرحلہ تک نہیں لے جانا ہے۔ افغانی معاشرہ پر کنٹرول کے بعد اسلامائزیشن کے عمل کو تعلیم و تربیت سے شروع کرنا ہے، نہ کہ کوڑا مارنے اور پھانسی دینے سے۔ انہیں فلسطین کی لڑائی کو فلسطین کے دائرہ تک محدود رکھنا ہے، اس کو ہرگز امریکہ تک نہیں پہنچانا ہے۔ انہیں پڑوسی ملکوں سے مصالحانہ رشتہ قائم کرنا ہے، نہ کہ حریفانہ اور رقیبانہ رشتہ۔

افغانی لوگوں میں ان کے علماء اور مفکرین نے جہاد کا جذبہ ابھارا تھا مگر انہیں صبر کا سبق نہیں دیا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ افغانیوں نے مذکورہ قسم کی بھیانک غلطیاں کیں۔ اور آخر میں رسوائی اور تباہی کے سوا ان کے حصہ میں کچھ اور نہ آیا۔

ایک بار میں ایک بڑی فیکٹری میں گیا۔ اس کا انجینئر مجھے فیکٹری کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے ایک مقام پر لے گیا۔ یہاں ایک مشین تھی۔ اس کے ساتھ اس کے بیرونی حصہ میں ایک بڑا فلائنگ وہیل (flying wheel) لگا ہوا تھا۔ انجینئر نے ایک سوئچ دبائی۔ اس کے فوراً بعد فلائنگ وہیل پوری اسپیڈ کے ساتھ ایک سمت میں تیزی سے گھومنے لگا۔ پھر انجینئر نے دوسری سوئچ دبائی۔ اس کے بعد ایک سکنڈ کے اندر فلائنگ وہیل اسی تیزی کے ساتھ برعکس سمت میں دوڑنے لگا۔

یہی انسانی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے اندر یہ دوطرفہ صلاحیت ہو ـــــ وہ آگے بڑھنے کے ساتھ پیچھے ہٹنا جانتے ہوں۔ وہ جنگ کے ساتھ امن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔ وہ اقدام کے ساتھ اقدام کی حدود سے واقف ہوں۔ وہ بولنے کے ساتھ چپ رہنے کو بھی کام سمجھتے ہوں۔ وہ نفرت کے ساتھ محبت کرنا بھی جانتے ہوں۔ وہ امامت کے ساتھ اقتداء کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ وہ مجاہد ہونے کے ساتھ صابر بھی ہوں۔ ایسے ہی لوگ دنیا میں کوئی حقیقی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ دوطرفہ صلاحیت نہ ہو وہ صرف تباہی کی مثالوں میں اضافہ کریں گے۔ وہ حقیقی تعمیر کا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔

قابل عمل فارمولا

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ ہر مذہب اپنی اپنی جگہ پر سچا ہے۔ کوئی مذہب نہ زیادہ سچا ہے اور نہ کوئی مذہب کم سچا۔ انھوں نے کہا کہ یہی واحد مذہبی نظریہ ہے جس سے دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ نظریہ غیر فطری بھی ہے اور غیر عقلی بھی۔ دنیا کی کسی بھی چیز میں آدمی ایسا نہیں کرتا کہ بیک وقت ہر بات کو یکساں طور پر درست سمجھے۔ مثلاً کوئی بھی انسان نہیں کہتا کہ زمین۔مرکزی گردش کا نظریہ بھی صحیح اور آفتاب۔مرکزی گردش کا نظریہ بھی صحیح۔ ہر آدمی ایک نظریہ کو صحیح اور دوسرے کو غلط بتاتا ہے۔ پھر مذہب ہی میں استثنائی طور پر ایسے ناقابل فہم نظریہ کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت۔

میں نے کہا کہ شہنشاہ اکبر نے حکومت کے زور پر یہ نظریہ چلانا چاہا مگر وہ نہیں چلا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے ۳۰ سال کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور کتاب Essential Unity of all Religions لکھی۔ مگر یہ انسائیکلوپیڈیائی کتاب بھی اس نظریہ کو قائم نہ کرسکی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی قائدانہ مقبولیت سے اس کو رواج دینا چاہا مگر وہ بھی ناکام ہوگئے۔ حتی کہ خود ان کا یہ حال ہوا کہ زندگی بھر وہ رام رحیم ایک ہے کہتے رہے مگر جب ان کو قتل کیا گیا تو ان کی زبان سے آخری الفاظ یہ نکلے "ہے رام" نہ کہ 'ہے رام ہے رحیم'۔

اس معاملہ میں زیادہ درست فارمولا وہ ہے جو قرآن میں دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لکم دینکم ولی دین (الکافرون) یعنی تمہارے لئے تمارا دین اور میرے لئے میرا دین۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی دوسری تعلیمات کو ملا کر اس کا ایک فارمولا بنایا جائے تو وہ یہ ہوگا — ایک کی پیروی کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one and respect all

اعتراف

امریکی میگزین نیوز ویک (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) کے صفحہ ۵۰ پر ایک فرانسیسی خاتون گروٹ (Groult) کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ اس میں کتاب کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ فرانس میں تحریک نسواں (Feminism) مایوسی کے دور سے گزر رہی ہے۔ مثلاً کتابوں کے ناشرین نے تحریک نسواں کے متعلق لٹریچر چھاپنا بند کر دیا ہے، کیوں کہ اس کے فروخت میں بہت کمی آگئی ہے۔

Publishers have stopped printing feminist literature because of poor sales.

فرانس میں تحریک نسواں کی مشہور خاتون لیڈر بیور (Simone de Beauvoir) چار سال پہلے مر گئیں۔ ان کے بعد کوئی خاتون لیڈر ابھر نہ سکی۔ فرانس کی تحریک نسواں کو زندہ رکھنے کے لئے ایک لیڈر کی تلاش ہے۔ ایک فرانسیسی خاتون نے اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کی عورتیں ممکن ہے کہ ایک غالب شوہر سے دور بھاگ سکی ہوں گی، مگر آخری چیز جو وہ چاہتی ہیں وہ دوسرا غالب ہے:

They may have escaped from a domineering husband and the last thing they want is another dominator.

مرد کو اللہ تعالیٰ نے فعال صفات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور عورت کو منفعل صفات کے ساتھ۔ دونوں صنفوں کے لئے فریضۂ حیات کے اعتبار سے یہی فطری تقسیم ہے۔ مغرب میں اس تعلیم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آخر کار فطرت غالب آئی۔ انسان کے خود ساختہ نظریات بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔

تجربہ نے اور علمی تحقیقات نے ثابت کیا کہ اسلام کا نظریہ صحیح تھا اور مغرب کا نظریہ غلط۔ یہ فطرت کی سطح پر خدائی دین کی تصدیق اور غیر خدائی نظاموں کی تردید ہے۔ اس کے بعد انسان کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ خدا کے دین کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

محبت اور علم

ٹامس کارلائل (Sir Thomas Carlyle) ۱۷۹۵ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۱ میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا شمار مغرب کے مشہور مصنفوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں لکھا ہے کہ محبت کرنے والا دل تمام علوم کا آغاز ہے:

A loving heart is the beginning of all knowledge.

قول نہایت بامعنیٰ ہے۔ مگر اس کی معنویت کو اس وقت تک سمجھا نہیں جاسکتا جب تک اس میں یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ ''نفرت کے اسباب کے باوجود محبت کرنے والا''۔ کیوں کہ اس دنیا میں نفرت اور بیزاری کے اسباب ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک انسانوں سے محبت نہیں کرسکتا جب تک وہ اس بلند حوصلگی کا ثبوت نہ دے کہ لوگوں کی طرف سے نفرت کا تجربہ پیش آنے کے باوجود وہ ان سے محبت کرے۔

خود ٹامس کارلائل کی زندگی اس کی ایک سبق آموز مثال ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد مغربی یورپ کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے سخت نفرت ہوگئی۔ اس نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پیغمبر اسلام کی شخصیت کو پہچان نہ سکے۔ صدیوں تک وہ آپ کو ایک برا انسان سمجھنے کی نادانی میں مبتلا رہے۔ ٹامس کارلائل نے صلیبی جنگوں کے پیدا کردہ اسباب نفرت سے اوپر اٹھ کر پیغمبر اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آپ کو پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا اور نہایت اونچے الفاظ میں آپ کی شخصیت کا اعتراف کیا۔ ٹامس کارلائل کا یہ اعتراف اس کی کتاب ہیروز اینڈ ہیوورشپ (Heroes and Hero worship) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اپنے سینہ میں اس دل کی پرورش کرنا جو نفرت کے باوجود محبت کرسکے، خود اپنے آپ کو عظیم ترین اخلاقی بلندی کی طرف لے جانا ہے۔ یہ اخلاقی صفت ہی وہ واحد زمین ہے جس کے اوپر علم کا پودا اگتا ہے اور بڑھ کر سرسبز و شاداب درخت بن جاتا ہے۔

کامیاب زندگی کا اصول

۲۶ جنوری ۲۰۰۳ کو میں دہلی سے احمد آباد گیا۔ راستہ میں انڈین ائر لائنز کی فلائٹ میگزین (Swagat) کا شمارہ جنوری ۲۰۰۳ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون کا عنوان یہ تھا— خواب پورا ہو گیا:

A Dream Comes True

اس میں بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹر ودیا ساگر تعلیم کے میدان میں خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کا شوق یہ تھا کہ نئی نسل کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس قابل بنائیں کہ وہ کامیاب زندگی گزار سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے راجستھان کے شہر الور میں ایک اسکول قائم کیا۔ اس اسکول کا نام ساگر اسکول ہے۔ مضمون نگار (Aditi Bishnoi) نے اسکول کی visit کی۔ ان سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر ودیا ساگر نے کہا— ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اچھے انسان بنائیں، جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ زندگی میں ہر صورت حال کا سامنا آسانی اور خود اعتمادی کے ساتھ کر سکیں:

Our aim is to produce good human beings capable of tackling all situations in life with ease and confidence (p. 88)

میں سمجھتا ہوں کہ ایجوکیشن خواہ وہ فارمل ایجوکیشن ہو یا انفارمل ایجوکیشن، دونوں ہی کا سب سے اہم نشانہ یہی ہونا چاہئے۔ اسکول اور میڈیا دونوں کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کے اندر وہ شعور پیدا کرے جس کے ذریعہ وہ زندگی کے مسائل کا سامنا کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔

اس سلسلہ میں کلیدی بات یہ ہے کہ یہ دنیا لین دین کے اصول پر قائم ہے۔ جیسا دینا ویسا پانا۔ اس دنیا میں کامیابی کا سب سے یقینی فارمولا یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ آپ وہی سلوک کریں جو آپ خود اپنے لئے چاہتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔

بزنس میں کہا جاتا ہے کہ کسٹمر فرنڈلی (customer friendly) بنو، تمہارا کاروبار ترقی کرے گا۔ جو اصول تجارت میں کامیابی کے لئے مفید ہے وہی پوری زندگی کے لئے مفید ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا

کہ ہر ایک کے لئے کامیاب زندگی کا عمومی فارمولا یہ ہے کہ — تم ہمیشہ انسان دوست بن کر رہو:

Be always insan friendly.

دوسروں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر ایک آپ کے لئے مددگار (cooperative) بن جاتا ہے اور جب پورا سماج آپ کے لئے مددگار بن جائے تو فطری طور پر یہ ہوگا کہ آپ کا ہر کام آسانی کے ساتھ ہونے لگے گا۔ یہ احساس آپ کے اندر خود اعتمادی پیدا کرے گا کہ آپ جو کام بھی کریں اس میں دوسروں کی طرف سے آپ کے لئے کوئی غیر ضروری رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔

دوستانہ رویہ کا کوئی محدود مفہوم نہیں۔ کسی سے میٹھی بات بولنا بھی دوستانہ رویہ ہے۔ راستہ سے رکاوٹ ہٹا دینا بھی دوستانہ رویہ ہے۔ کسی کو ایک اچھا مشورہ دینا بھی دوستانہ رویہ ہے۔ کسی کو اچھے الفاظ میں یاد کرنا بھی دوستانہ رویہ ہے— کسی کے خلاف اپنے دل میں برا خیال نہ رکھنا بھی دوستانہ رویہ ہے، کسی سے شکایت کے باوجود دل میں تلخی نہ رکھنا بھی دوستانہ رویہ ہے۔ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت کسی کے لئے دعا کرنا بھی دوستانہ رویہ ہے۔ ضرورت کے وقت کسی کے کام آنا بھی دوستانہ رویہ ہے، وغیرہ۔

کسی کو دکھ نہ پہنچایئے، آپ کو بھی کسی سے دکھ کا تجربہ نہیں ہوگا۔ ہر ایک کے لئے نفع بخش بن جایئے، آپ کو بھی ہر ایک سے نفع ملنا شروع ہو جائے گا۔

تعلیم کا مقصد ملازمت نہیں، تعلیم کا مقصد لوگوں کو باشعور بنانا ہے۔ یعنی ایسا انسان جو معاملات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ جانے، جو حالات کا تجزیہ کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا ہو۔ باشعور انسان کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ جذباتی اقدام نہ کرے۔ وہ صحیح اور غلط اور ممکن اور ناممکن کے درمیان فرق کر سکے۔ ایسا انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ استحصالی لیڈروں کے بہکاوے میں نہ آئے۔ وہ خود اپنی عقل کے تحت درست فیصلہ کرے۔ ایسا ہی انسان وہ انسان ہے جس کو حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ انسان کہا جا سکے۔ اسکول اور میڈیا دونوں کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے انسان پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

معلومات اور تجزیہ

ایک صاحب نے ایک جریدہ دکھایا۔ اس میں سید جمال الدین افغانی کے بارے میں ایک مفصل مضمون تھا۔ اس مضمون کا خاتمہ اس طرح ہوا تھا: سید جمال الدین افغانی نے زندگی کے آخری ایام استنبول میں سخت ذہنی اذیت میں گزارے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد عالم اسلام کا اتحاد تھا جو یہاں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ خفیہ طور پر ان کی جاسوسی بھی کی جاتی۔ آخر اسی کرب میں ۱۸۹۷ کو بعمر اٹھاون برس سرطان کے عارضہ میں انھوں نے استنبول میں وفات پائی۔

سید جمال الدین افغانی کو اپنے زمانہ میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ افغانستان، مصر، ایران، ترکی وغیرہ میں ان کو بہت زیادہ مواقع ملے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ ہر ملک سے نکال دیئے جاتے کیوں کہ وہ جہاں پہنچتے وہاں وہ حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریر شروع کر دیتے۔ سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کے بارے میں لوتھروپ سٹوڈراڈ نے درست طور پر لکھا ہے کہ: ان کے خیال کے مطابق، مغرب مشرق کا دشمن ہے۔ یوروپ کے سینے میں آج بھی وہی صلیبی روح کام کر رہی ہے جو راہب پطرس کے زمانہ میں مصروف کار تھی۔ اہل مغرب میں اب بھی وہی تعصب جاری وساری ہے۔ یہ ہر طریقہ سے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کی تحریکات کو نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عالم اسلام پر واجب ہے کہ وہ اپنی بقاء کے لئے متحد ہو جائے۔

سید جمال الدین افغانی اپنی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود مکمل طور پر ناکام رہے۔ اس کا سبب تلاش کرتے ہوئے ایک بنیادی بات میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ ان کے اندر غیر معمولی حافظہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی کتاب ایک بار پڑھنے کے بعد ان کے سینے میں محفوظ ہو جاتی تھی مگر میرے علم کے مطابق وہ تدبر کی صفت سے خالی تھے۔ جن لوگوں کا حافظہ بہت اچھا ہو وہ ہر مجلس میں معلومات کا انبار بکھیرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی معلومات سے متاثر ہو کر ان کو بڑا عالم مان لیتے

ہیں۔ مگر حقیقی عالم وہ ہے جس کے اندر تجزیہ اور تحلیل (analysis) کی صفت ہو۔ اور میرے علم اور تجربہ کے مطابق فطرت کا یہ اصول ہے کہ جس کے اندر غیر معمولی حافظہ ہوتا ہے اس کے اندر تجزیہ کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔

کسی شخص کو حافظہ کی قوت حاصل ہو تو اس کے دماغ میں معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ اکھٹا ہو جائے گا۔ اُس کی گفتگو اور اس کی تقریر و تحریر میں معلومات کی کثرت دکھائی دینے لگے گی۔ عام لوگ اس کو ایک قابل انسان سمجھنے لگیں گے۔ مگر اس کی معلوماتی بارش سے کوئی فصل نہیں اُگے گی۔ حتیٰ کہ اگر آپ سننے والوں سے پوچھیں کہ جس کی تقریر کی تم تعریف کرر ہے ہو اُس کی تقریر کا خلاصہ کیا تھا تو یہ لوگ اُس کا کوئی خلاصہ بتانے میں ناکام رہیں گے۔

تجزیہ کے بغیر معلومات کی حیثیت ایک جنگل کی ہے۔ تجزیہ کیا ہے۔ تجزیہ یہ ہے کہ مختلف معلومات کا گہرا مطالعہ کر کے اُس کا نتیجہ نکالا جائے۔ مثلاً ہندستان کی آزادی سے پہلے ایک سیاسی لیڈر کی تقریر بہت مقبول ہوئی۔ اُن کا حافظہ اتنا زبردست تھا کہ وہ محض اپنی یادداشت سے انگریزی حکومت کے خلاف زبردست معلوماتی تقریر کرتے اور پھر یہ کہہ کر لوگوں کو مسحور کر دیتے کہ:

Slavery or freedom, choose between the two.

حالاں کہ اگر انہیں بصیرت کی نظر حاصل ہوتی اور وہ حقیقی واقعات کی روشنی میں فیصلہ کر پاتے تو اس کے بجائے شاید وہ یہ کہتے کہ:

Non-corrupt British rule or corrupt
Indian rule—choose between the two.

وہ تمام لیڈر جنہوں نے قوموں کو تباہی سے دوچار کیا، وہ وہی لوگ تھے جن کے پاس حافظہ تو تھا مگر اُن کے پاس تجزیہ کی طاقت موجود نہ تھی۔ اس بنا پر وہ حالات کو گہرائی کے ساتھ سمجھ نہ سکے۔ حافظہ بھیڑ اکھٹا کر سکتا ہے۔ مگر تجزیہ اور تحلیل کے بغیر کسی نتیجہ خیز جدوجہد کا ظہور ممکن نہیں۔

محرومی پر راضی ہونا

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو "پانے" کو اپنا مقصد بناتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو اس حوصلہ کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ "دینے" کو اپنا مقصد بنائیں گے۔ پہلی قسم کے لوگ اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ دنیا میں انقلاب لاتے ہیں، وہ نئی تاریخ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں اس قربانی کا سب سے بڑا نمونہ وہ گروہ ہے جس کو انصار کہا جاتا ہے۔ یعنی قدیم مدینہ کے وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کے بعد رسول اور اصحاب رسول کا ساتھ دے کر خدا کے دین کو دعوت کے مرحلہ سے نکال کر انقلاب کے مرحلہ میں پہنچا دیا۔

انصاریت کیا ہے۔ انصاریت دینے پر راضی ہونا ہے۔ مکہ کے مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار اس پر راضی ہوئے کہ وہ اپنے گھروں کو اور اپنی جائدادوں کو تقسیم کر دیں۔ ان کا آدھا حصہ خود لیں، اور بقیہ آدھا مہاجرین کو دینے پر راضی ہو جائیں۔ انصار اس یکطرفہ تقسیم پر راضی ہوئے۔ غزوہ حنین میں بہت بڑی مقدار میں غنائم حاصل ہوئے۔ دوبارہ انصار اس پر راضی ہوئے کہ غنائم سب کے سب مکہ کے لوگوں کو دے دئے جائیں اور انصار کا ان غنائم میں کوئی حصہ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب خلیفہ مقرر کرنے کا سوال ہوا تو انصار اس پر راضی ہوئے کہ خلافت پورے طور پر قریش کو دے دی جائے۔ اور انصار کا کوئی آدمی خلیفہ نہ بنایا جائے۔ انصار اس پر راضی ہو گئے کہ خلافت قریش کے لئے ہوگی۔ ان کا کوئی حصہ خلافت میں نہ ہوگا۔

اس دنیا میں لوگ پانے کی بنیاد پر راضی ہوتے ہیں۔ انصار وہ لوگ تھے جو نہ پانے کی بنیاد پر راضی ہوئے۔ یہ قربانی کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ یہ لڑنے مرنے کی قربانی سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی ہے۔ یہ قربانی وہ ہے جو تاریخ بناتی ہے۔ تاریخ سازی کا منصوبہ صرف اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ کچھ لوگ اس عظیم قربانی کو دینے پر راضی ہو جائیں۔

قناعت کامیابی کا راز

ایک عوامی مثل ہے۔ یہ مثل زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے۔ اس مثل کے الفاظ یہ ہیں ''آدھی چھوڑ کے پوری دھاوے، پوری ملے نہ آدھی پاوے''۔

اصل یہ ہے کہ انسان بیشتر حالات میں اپنی خواہشات اور اپنی امنگوں (ambitions) کے تحت سوچتا ہے۔ اس بنا پر اکثر وہ ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جو حقیقی حالات کے اعتبار سے اس کے لئے قابلِ حصول نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا عمل انجام کے اعتبار سے مکمل ناکامی پر ختم ہوتا ہے، وہ ناممکن کو حاصل کرنے کی کوشش میں ممکن کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اکثر مشہور مسلم رہنماؤں کی کہانی یہی ہے۔ انہوں نے حقائق کی رعایت کئے بغیر محض اپنی خواہشوں اور امنگوں کے تحت بڑی بڑی چھلانگ لگا دی، اس کا نتیجہ ملت کے حصہ میں تباہی کے سوا کچھ اور نہ آیا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں لیجئے۔

۱۔ سردار شوکت حیات خاں مشہور پاکستانی لیڈر ہیں۔ وہ متحدہ پنجاب کے سابق وزیر اعظم مرحوم سر سکندر حیات خان کے صاحبزادے ہیں۔ سردار شوکت حیات خان نے اپنے کیریر کا آغاز دوسری جنگ عظیم میں فوجی افسر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۴۳ میں مسلم لیگ کی سیاست میں سر گرم طور پر شامل ہوگئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ پنجاب کے وزیر بنے اور وہاں کے دوسرے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

سردار شوکت حیات خاں نے اپنی زندگی کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے جس کا نام (دی نیشن دیٹ لوسٹ اٹس سول (The Nation that lost its soul) ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ (گم گشتہ قوم) دسمبر ۱۹۹۵ء میں پاکستان سے چھپا ہے۔ کتاب کا یہ اردو ایڈیشن ۴۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ناشر جنگ پبلشرز لاہور ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ''لیاقت علی خاں'' ہے جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ اس باب میں

مختلف باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''نواب زادہ لیاقت علی خان'' کو حقائق اور ملک کے جغرافیہ سے بھرپور واقفیت نہ تھی۔ جس کے وہ پہلے وزیر اعظم بن چکے تھے۔ .... بعد میں کشمیر پر حملہ کے دوران جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن لاہور آیا۔ ایک ڈنر، جس میں لیاقت، گورنر مودی اور پنجاب کے چار وزیر موجود تھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کا پیغام پہنچایا۔ پٹیل جو ہندستان کی ایک طاقتور شخصیت تھا۔ اس کا پیغام تھا کہ اس اصول کی پابندی کی جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں طے پایا تھا وہ یہ کہ ریاست اپنے باشندوں کی اکثریت اور سرحدوں کے ساتھ ملاپ کی بنا پر پاکستان یا ہندستان کے ساتھ الحاق کریں گی۔ پٹیل نے کہا کہ پاکستان کشمیر کو لے لے اور حیدر آباد دکن کا مطالبہ چھوڑ دے جہاں پر ہندو آبادی کی اکثریت تھی اور جس کا پاکستان کے ساتھ زمینی یا سمندری ذریعہ سے کوئی اتصال بھی نہ تھا۔ یہ پیغام دینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن گورنمنٹ ہاؤس میں آرام کرنے چلا گیا۔

میں کشمیر آپریشن کا مکمل نگراں تھا۔ میں نے لیاقت علی خاں کے پاس جا کر انہیں تجویز دی کہ ہندستان کی فوج جو کشمیر میں داخل ہو چکی ہے، ہم قبائلیوں کی مدد سے اس کو باہر نکالنے اور کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری اس وقت کی فوج بھی اس کامیابی کے حصول میں شاید مددگار ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا ہمیں سردار پٹیل کی پیشکش کو ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ نواب زادہ نے میری جانب مڑ کر کہا'' سردار صاحب، کیا میں پاگل ہو گیا ہوں کہ میں کشمیر کے پہاڑوں اور ٹیلوں کے بدلے ریاست حیدر آباد دکن کو چھوڑ دوں جو پنجاب سے بھی بڑی ریاست ہے''

پرائم منسٹر کے اس ردعمل کو دیکھ کر میں تو سن ہو گیا کہ ہمارا وزیر اعظم ملکی جغرافیہ سے اتنا بے خبر تھا۔ اس کی ذہانت کا یہ معیار کہ وہ حیدر آباد دکن کو کشمیر پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تو احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات تھی۔ حیدر آباد کا حصول ایک سراب تھا جب کہ کشمیر اپنے آپ مل رہا تھا۔

کشمیر کی پاکستان کے ساتھ اہمیت سے وہ قطعی واقف نہیں تھے۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر میں نے کشمیر آپریشن کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا'' (صفحہ ۲۳۱۔ ۲۳۲)

سردار شوکت حیات خاں کا یہ بیان اس دردناک حقیقت کی ایک واضح مثال ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر کس طرح مذکورہ مثل کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ ممکن اور ناممکن کے فرق کو سمجھ نہ سکے۔ وہ نہ ملنے والی چیز کو پانے کے لئے دوڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملنے والی چیز بھی ان سے کھوئی گئی اور نہ ملنے والی چیز تو سرے سے ملنے والی ہی نہ تھی۔

۲۔ اب اس نوعیت کی ایک اور مثال لیجئے۔ اس مثال کا تعلق ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور سے ہے جب کہ برصغیر ہند میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ اس مثال کو اردو ہفت روزہ الجمعیۃ سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ (۳۔ ۵ مئی ۱۹۳۰ء) سے کچھ روز قبل وائسرائے ہند کی کونسل کے ایک ذمہ دار ممبر سر میاں فضل حسین مرحوم نے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کو بلا کر یہ پیش کش کی کہ آپ جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی تجویز پاس نہ ہونے دیں۔ میں حکومت برطانیہ سے مقبرہ صفدر جنگ اور اس سے ملحقہ جائداد بمعہ اراضی جمعیۃ علماء ہند کے علمی کاموں کے لئے دلوادوں گا۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں فرمایا'' میاں صاحب! تمام علماء کرام وزعماء عظام مجھے بے وقوف نہیں بنائیں گے کہ ہم پورے ملک کو حاصل کرنے کی تجویز پاس کر رہے ہیں اور تم صرف ایک مقبرہ وہ بھی مسلمانوں کی وقف ملکیت پر فیصلہ کر رہے ہو۔ مولانا کے جواب سے میاں صاحب موصوف کو بہت مایوسی ہوئی۔ یہ واقعہ حضرت مولانا نے راقم الحروف سے خود بیان فرمایا تھا۔

(جمعیۃ علماء ہند کا پچاس سالہ عہد، از شیخ عبد الحق پراچہ دہلوی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲ جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۸)

۱۹۳۰ء کے اس واقعہ کو اب ۷۵ سال کے بعد کے حالات کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم

ہوگا کہ اس معاملہ میں وہی صورت پیش آئی جس کا ذکر مذکورہ عوامی مثل میں کیا گیا ہے، پچھتر سال پہلے کے رہنماؤں کو ایک نہایت قیمتی موقع کسی کوشش کے بغیر مل رہا تھا مگر وہ اس قیمتی موقع سے صرف اس لئے فائدہ نہ اٹھا سکے کہ ان کے ذہن میں ایک بہت بڑی چیز بسی ہوئی تھی۔ اگر چہ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے وہ چیز انہیں ملنے والی ہی نہ تھی۔

انگریزوں کی مذکورہ پیش کش اپنے امکانات کے اعتبار سے وہی اہمیت رکھتی تھی جس کی پیش کش مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں انگریز تاجر کو کی گئی اور اس نے اس کو فوراً قبول کرلیا۔ پچھتر سال پہلے کے مسلم رہنما اگر انگریز کی مذکورہ پیش کش کو قبول کر لیتے اور اس کو علمی اور تعلیمی اور دعوتی مرکز بنا دیتے تو اس کے نتائج اتنے دوررس نکلتے کہ شاید تاریخ کا نقشہ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔

اوپر جو دو مثالیں پیش کی گئیں یہی موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مشہور رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے کام کے عظیم مواقع موجود تھے۔ مگر تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ وہ ناممکن کو نشانہ بنا کر اس کی طرف دوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن کو بھی حاصل نہ کر سکا اور ناممکن تو حاصل ہونے والا ہی نہ تھا۔

مثلاً سید جمال الدین افغانی کو ترکی کی عثمانی سلطنت نے کام کے عظیم مواقع دیے مگر جمال الدین افغانی خود عثمانی سلطنت کی جڑ اکھاڑنے پر تل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکی کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، مصر کے سید قطب کو وزارت تعلیم بہت چھوٹی چیز لگی۔ وہ خود ناصر کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہونا پڑا۔

یہی معاملہ پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ پیش آیا۔ وہاں کے سابق حکمراں صدر محمد ایوب خاں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ساتھیوں کو یہ پیش کش کی کہ وہ حکومت کے مکمل تعاون سے پاکستان میں بڑے پیمانہ پر ایک نیشنل یونیورسٹی بنائیں اور اس کے ذریعہ وہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر کام کریں۔ مگر دوبارہ یہی ہوا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مذکورہ پیش کش

چھوٹی معلوم ہوئی۔ انہوں نے پوری حکومت پر قبضہ کرنے کی دھنوادھار تحریک شروع کر دی مگر تمام کوششوں کے بعد آخر کار جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ وہ چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہو کر رہ گئے۔

یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم رہنماؤں کی کہانی ہے۔ وہ اپنی خیالی امنگوں میں اتنا گم ہوئے کہ انہیں حقائق و واقعات کی خبر نہ ہو سکی۔ وہ بڑے بڑے نشانوں کو اپنا مقصد بنا کر ان کی طرف دوڑتے رہے، حالانکہ یہ نشانے سرے سے ان کے لئے قابل حصول ہی نہ تھے۔ اور جو چیز ان کے لئے حالات کے اعتبار سے قابل حصول تھی وہ انہیں دکھائی ہی نہ دی۔ اسی غیر حقیقت پسندانہ مزاج کا نتیجہ ہے کہ ان مشہور رہنماؤں نے صرف ناکام اقدامات کی مثالیں قائم کیں، وہ کامیاب اور نتیجہ خیز اقدام کی مثال قائم نہ کر سکے۔ زیادہ کو پانے کی کوشش میں وہ تھوڑے سے بھی محروم رہے۔

مسلم رہنماؤں کی اس بھیانک غلطی کا سبب یہ تھا کہ تھوڑے کو وہ صرف تھوڑا سمجھے، وہ تھوڑے کو زیادہ کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ وہ زندگی کے اس راز سے ناآشنا رہے کہ عمل کا آغاز ہمیشہ تھوڑے سے کیا جاتا ہے، زیادہ سے عمل کا آغاز ممکن نہیں، جو آدمی اس راز کو سمجھ لے وہ تھوڑے سے شروع کر کے آخر کار زیادہ تک پہنچ جائے گا۔ اور جو شخص اس راز کو نہ سمجھے وہ اپنے غیر حقیقت پسندانہ مزاج کی بنا پر اپنے عمل کا نقطہ آغاز ہی نہ پائے گا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی اپنے سفر کا نقطہ آغاز پالے وہ کبھی نہ کبھی اپنی منزل تک پہنچ جائے گا، اور جو آدمی اپنے سفر کا نقطہ آغاز نہ پائے وہ کبھی اپنی منزل تک نہ پہنچے گا خواہ وہ ساری عمر بے فائدہ دوڑ دھوپ کرتا رہے___ زندگی کے اسی اصول کا نام دینی اصطلاح میں قناعت ہے اور قناعت بلاشبہہ ہر قسم کی انفرادی اور اجتماعی کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ۔ الترمذی، کتاب الزھد۔ مسند احمد بن حنبل، وغیرہ۔ مسند احمد کے الفاظ یہ

ہیں:أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قد أفلح من أسلم ورزق كفافاً و قنعه الله بما أتاه (مسند أحمد ۲/۱۶۸) یعنی اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو اس پر قناعت دی جو اس کو اس نے دیا۔

اس حدیث کو عام طور پر انفرادی معنوں میں اور معاشی مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ مگر وہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس حدیث کا پورا مطلب یہ ہے کہ افراد یا قوموں کو موجودہ زمانہ میں جو کچھ ملے یا حالات کے اعتبار سے جو ان کے لئے ممکن ہو اس کو وہ خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں، اس پر راضی رہتے ہوئے وہ اپنا عمل شروع کر دیں۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ ملے ہوئے کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ ان کو حال میں حاصل نہیں، وہ ان کی منصوبہ بند جدوجہد کے نتیجہ میں مستقبل میں حاصل ہو جائے۔

باب سوم

حفاظت کیجیے

سفید کپڑے پر کوئی دھبہ لگ جائے تو آدمی فوراً اُس کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر فوراً اُس کو صاف نہ کیا تو بعد کو دھبہ نہیں مٹے گا اور اس کا کپڑا مستقل طور پر داغ دار ہو جائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آدمی کے ذہن کا ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے بار بار آدمی کے ذہن میں کوئی نہ کوئی بری بات آتی رہتی ہے۔ مثلاً انتقام کا جذبہ، حسد کا جذبہ، دشمنی کا جذبہ، شکایت کا جذبہ، نفرت کا جذبہ، وغیرہ۔ اس قسم کے جذبات اور احساسات بار بار ہر مرد اور ہر عورت کے ذہن میں صبح و شام آتے رہتے ہیں۔ وہ آدمی کو منفی احساسات میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔

ایسا ہر تجربہ گویا ایک قسم کا نفسیاتی دھبّہ ہے۔ وہ آدمی کے نفسیاتی وجود کو داغ دار کرنے کا ایک واقعہ ہے۔ ان نفسیاتی دھبوں کے لیے بھی آدمی کو وہی کرنا ہے جو وہ مادی دھبوں کے لیے کرتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہئے کہ جیسے ہی اس قسم کا کوئی دھبّہ اُس کے نفسیاتی وجود پر لگے تو فوراً وہ اس کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔ وہ کوئی نہ کوئی توجیہہ کر کے فوراً اپنے آپ کو اس کے زیر اثر آنے سے بچالے۔ جو مرد یا عورت ایسا نہ کرے اُس کو ایسا نہ کرنے کی یہ بھاری قیمت دینی پڑے گی کہ وہ نفسیاتی دھبّہ اُس کے وجود کا مستقل حصہ بن جائے گا۔ وہ اُس کی داخلی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے داغ دار کر دے گا۔

جدید نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک زندہ ذہن اور دوسرا خفتہ ذہن۔ فطری نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بات آدمی کے ذہن میں داخل ہوتی ہے تو پہلے دن وہ اُس کے زندہ ذہن میں رہتی ہے۔ اس کے بعد آدمی جب رات کو سوتا ہے تو نیند کی حالت میں انسانی دماغ کا فطری نظام اس بات کو زندہ ذہن سے نکال کر خفتہ ذہن میں پہنچا دیتا ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو پھر وہ بات آدمی کے پورے وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ اُس کو

ذہن سے نکالنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر عورت اور مرد دوسروں کے بارے میں شکایتوں اور تلخیوں میں جیتے ہیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی کے خلاف منفی نفسیات کا شکار رہتا ہے۔ مگر عین اسی وقت وہی مرد اور عورت اپنے بیٹا اور اپنی بیٹی کے لیے ہمیشہ مثبت احساسات کا نمونہ بنے رہتے ہیں۔ حالاں کہ ہر مرد و عورت کو اپنے اولاد سے بھی اسی طرح شکایات کے تجربے ہوتے ہیں جس طرح دوسروں سے ہوتے ہیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ شکایتوں کے باوجود لوگ اپنی اولاد کے معاملہ میں ہمیشہ معتدل بنے رہتے ہیں۔ جب کہ یہی لوگ دوسروں کے بارہ میں معمولی شکایتوں کو لے کر اُس کے خلاف ہمیشہ کے لیے نفرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ لوگ ان دونوں کے معاملہ میں دو الگ الگ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اُن کو جب اپنی اولاد کی طرف سے شکایت کا تجربہ ہوتا ہے تو اُسی وقت وہ کوئی نہ کوئی توجیہہ کر کے اُس کو ختم کر دیتے ہیں۔ اپنی اولاد کے خلاف شکایت کو وہ اپنے ذہن سے فوراً نکال دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب اُن کو دوسروں سے کوئی شکایت پیش آجائے تو وہ اُس کو اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں۔ وہ اُس کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگوں سے اس کا چرچا کرتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ہر روز اُس کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے رہتے ہیں۔

اسی فرق کی بنا پر ایسا ہے کہ اپنی اولاد کے خلاف شکایتیں اُن کے وجود کا حصہ نہیں بنتیں، وہ پیدا ہوتے ہی فوراً ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کے خلاف شکایتیں ہمیشہ کے لیے ان کے وجود کا حصہ بن جاتی ہیں، وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتیں۔

یہ ذاتی تجربہ ہر آدمی کو بتاتا ہے کہ اُس کو دوسروں کے معاملہ میں کیسا ہونا چاہئے۔ اُس کو ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے معاملہ میں ہے — جب بھی کسی کے خلاف کوئی منفی احساس پیدا ہو تو وہ فوراً ہی اس کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ کسی بھی حال میں وہ اُس کو اپنے ذہن کا مستقل حصہ نہ بننے دے۔

فرق کا مسئلہ

ایک چیز اور دوسری چیز میں فرق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے قانونی تفریق اور دوسری ہے فطری تقسیم۔ قانونی تفریق انسان وضع کرتا ہے۔ اس لئے اس کو بدلنا ممکن ہے۔ لیکن فطری تقسیم خود خالق کائنات کی طرف سے قائم کی گئی ہے۔ اس کو بدلنے کی کوشش کرنا حقیقت واقعہ سے لڑنا ہے۔ اور حقیقت واقعہ سے لڑ کر کبھی کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔

مثال کے طور پر کسی ملک میں اگر یہ قانون بنا دیا جائے کہ ٹرین کے فرسٹ کلاس میں صرف سفید فام لوگ سفر کر سکتے ہیں، اور جو لوگ سیاہ فام ہیں وہ صرف سیکنڈ کلاس کی بوگی میں سفر کریں۔ انسانی ضمیر کبھی اس کو قبول نہیں کرے گا۔ ایسے قانون کے معاملہ میں درست بات یہ ہوگی کہ ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

مگر عورت اور مرد کے درمیان فرق کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ سادہ طور پر ایسا نہیں ہے کہ جس طرح اونچی ذات کے لوگوں نے اپنے اور نیچی ذات کے درمیان امتیازی قوانین بنا ڈالے اسی طرح مردوں نے بھی عورتوں کے خلاف امتیازی قانون بنا رکھے ہیں۔ اور اس بنا پر عورت اور مرد زندگی کے میدان میں دوش بدوش نہیں چل رہے ہیں۔ بلکہ یہ معاملہ فطری تقسیم کا معاملہ ہے۔ یہ خود خالق فطرت ہے جس نے عورت اور مرد کے درمیان فرق قائم کیا ہے۔ نہ کہ کسی انسان نے۔

اصل یہ ہے کہ انسانی زندگی میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے کاموں کی درست ادائیگی سے ایک اچھا سماج بنتا ہے۔ اس معاملہ میں فطرت نے یہ کیا ہے کہ اس نے تقسیم کار کے اصول پر کچھ کام مردوں کے لئے خاص کر دئے ہیں۔ اور کچھ کام عورتوں کے لئے۔ مثلاً سخت کام مردوں کے لئے اور ہلکے کام عورتوں کے لئے۔ یا سماج کے خارجی امور کو بنیادی طور پر مردوں سے متعلق کر دیا گیا اور داخلی امور کو بنیادی طور پر عورتوں سے۔ عورت اور مرد کا تخلیقی نقشہ اسی تقسیم کار کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس تقسیم کار کو بدلنے کے لئے ہمیں خود تخلیقی نقشہ کو بدلنا پڑے گا۔ ہم تخلیقی نقشہ کو بدل نہیں سکتے اس لئے واحد عملی طریقہ یہ ہے کہ تقسیم کار کے اس اصول کو مان لیا جائے۔

تبدیلی کا عمل

کائنات ایک عظیم کارخانہ ہے۔ ہم روزانہ جو خوراک کھاتے ہیں، وہ قدرت کے اس عظیم کارخانہ کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس کارخانہ کے اندر ہونے والے بے شمار عمل کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ غیر ذی روح مادی اشیاء غلہ سبزی اور گوشت وغیرہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جن کو ہم خوراک کہتے ہیں۔

اس کے بعد جب وہ پیٹ میں داخل ہوتی ہیں تو دوبارہ ایک اور تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اب پورا انسانی جسم دوبارہ متحرک ہو جاتا ہے۔

اس حرکت و عمل کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ کھائی ہوئی چیزیں وہ مختلف حیاتیاتی خلیے (cells) تیار کرتی ہیں جو انسان کے جسم میں خون اور گوشت اور ہڈی اور دوسری چیزوں کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ پیٹ کے اندر ہونے والی یہ تبدیلی ہمارے وجود کو مسلسل طور پر زندہ اور متحرک رکھتی ہے۔

یہ دو تبدیلیاں وہ ہیں جو طبیعی طور پر فطرت کے مقرر کئے ہوئے نظام کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آپ عمل میں آتی ہیں۔ اور خود اپنے اندرونی قوانین کے تحت اپنی تکمیل تک پہنچتی ہیں۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ سوچے کہ خدا نے کس طرح اس کے حیات جسمانی کے لئے ایک عظیم انتظام کر دیا۔ حالاں کہ اس نے خدا سے اس کی درخواست بھی نہیں کی تھی ——— یہ احساس آدمی کے اندر اتنی شدت سے پیدا ہونا چاہئے کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ احساس شکر کے جذبے سے اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑیں۔ اور پھر سراپا سپاس بن کر اس کی زبان سے شکر کا کلمہ نکل پڑے۔

پہلی دو تبدیلیاں نظام فطرت کے تحت اپنے آپ پیش آتی ہیں۔ اور دوسری تبدیلی انسان کو خود اپنے شعور کے تحت وجود میں لانا ہے۔ یہی ان خدائی نعمتوں کی قیمت ہے۔ جو شخص یہ قیمت ادا کر دے وہی خدا کی نعمتوں کے استعمال کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔

شکایت ایک نفسیاتی کمزوری

شکایت کا سبب کوئی انسان نہیں، اس کے اسباب خود قانونِ فطرت کے اندر ہیں۔ جب بھی کچھ لوگ مل کر رہیں یا مل کر کوئی کام کریں تو لازماً ایک کو دوسرے سے ناخوش گوار تجربات ہوتے ہیں۔ یہی تجربات شکایت پیدا کرتے ہیں۔ اب جو آدمی شکایت کو فطرت کے نظام کا ایک تقاضہ سمجھے وہ اس کو نظر انداز کردے گا۔ اور جو آدمی شکایت کو ایک شخص کا فعل سمجھ لے وہ اس کے خلاف شکایت میں مبتلا ہو جائے گا۔

کوئی بڑا کام کرنے کے لئے ہمیشہ متحدہ کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی کچھ لوگ متحد ہوں گے تو لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت بھی پیدا ہوگی۔ اب اگر ایسا ہو کہ لوگ شکایتوں کو لے کر ساتھ چھوڑ دیں تو کبھی کوئی بڑا کام نہیں ہوسکتا۔ بڑا کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ شکایت کے باوجود متحد رہیں، شکایت کے باوجود وہ مقصد کی خاطر دوسروں سے جڑے رہیں۔

اس معاملہ کا دوسرا سخت تر پہلو ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں شکایت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے شکایتی مزاج کے لوگ عملاً ڈبل اسٹینڈرڈ بن جاتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے ہیں کہ جہاں ان کا گہرا انٹرسٹ وابستہ ہو، وہاں تو وہ شکایت کو نظر انداز کر کے جڑے رہتے ہیں۔ اور جہاں گہرے انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ فوراً شکایت لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شکایتی مزاج ایک قسم کی نفسیاتی کمزوری ہے۔ اس نفسیاتی کمزوری کے ساتھ آدمی کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ حتی کہ یہ نیکی بھی اس کے لئے مقدر نہیں کہ کوئی شخص ایک بڑا کام کر رہا ہو تو وہ اس کا اعتراف کرے۔ کیوں کہ اپنے مزاج کی بنا پر اس کو کوئی نہ کوئی ایسی شکایتی بات مل جائے گی جس کا حوالہ دے کر وہ اس کو رد کردے اور اس سے الگ ہو جائے۔

مسائل کے باوجود

زندگی مسائل کے درمیان زندہ رہنے کا نام ہے۔ اس دنیا میں بے مسئلہ زندگی سرے سے ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار رہتا ہے۔ خواہ وہ دولت مند ہو یا غریب، خواہ وہ طاقت ور ہو یا کمزور، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔

مگر انسان کا مزاج مسئلہ سے گھری ہوئی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ ہر آدمی مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ جس مسئلہ میں مبتلا ہے اس کو ختم کردے تاکہ اس کو بے مسئلہ زندگی حاصل ہوجائے۔ مگر جب وہ سالہا سال کی کوشش کے بعد ایک مسئلہ کو ختم کر لیتا ہے تو عین اسی وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ نئے مسائل سے دوچار ہوگیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دوسرا مسئلہ پہلے مسئلہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

یہ ایک ایسی غلطی ہے جس میں تقریباً ہر آدمی مبتلا رہتا ہے۔ وہ ساری عمر بے مسئلہ زندگی کی تلاش میں رہتا ہے۔ مگر وہ کبھی اپنے مقصد کو نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی حال میں دنیا سے چلا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کے لئے انتخاب بامسئلہ زندگی اور بے مسئلہ زندگی کے درمیان نہیں ہے، بلکہ یہاں آدمی کو ایک قسم کے مسئلہ اور دوسرے قسم کے مسئلہ کے درمیان انتخاب کرنا ہے۔ اور جب ایک مسئلہ کو ختم کرکے دوسرا مسئلہ سامنے آنے والا ہو تو عقل مندی یہی ہے کہ آدمی اسی مسئلہ پر راضی ہوجائے جس میں ابتداءً وہ اپنے آپ کو مبتلا پارہا تھا۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی مسائل کے باوجود اپنے لئے کام کے مواقع تلاش کرے۔ نہ کہ وہ مسائل کو ختم کرنے میں لگا رہے، یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مرجائے۔

یہ ایک ایسی عام کمزوری ہے جس میں افراد بھی مبتلا رہتے ہیں اور قومیں اور جماعتیں بھی۔ اس دنیا میں فرد اور قوم دونوں کے لئے کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ وہ مسائل کے ساتھ جینا سیکھیں اور مسائل کے رہتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

مشتے بعد از جنگ

دو پہلوانوں کے درمیان کشتی ہو۔ ان میں سے ایک دوسرے کو پچھاڑ کر اس کے اوپر بیٹھ جائے، اس کے بعد ہارا ہوا آدمی اپنے ہاتھ سے جیتے ہوئے پہلوان کو مارنا چاہے تو اس کو فارسی میں مشتے بعد از جنگ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا فعل سراسر احمقانہ ہے، کسی بھی درجہ میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جب نزاع پیدا ہو تو اس کے ابتدائی مرحلہ میں وہ وقت ہوتا ہے جب کہ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہو۔ اگر آپ نے کسی جھوٹے بھرم میں پڑ کر اس وقت کو کھو دیا تو اس کے بعد آپ کے لئے صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہو گیا ہے اس کو صبر و تحمل کے ساتھ گوارا کریں۔ فیصلہ کا وقت گزر جانے کے بعد جنگ کو جاری رکھنا صرف اپنے نقصان میں اضافہ کرنا ہے۔ اس قسم کی کوشش مشتے بعد از جنگ ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں کسی کے لئے نیا مستقبل پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ بے شمار عوامل کے تحت ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے معلوم اور نامعلوم اسباب یکجا ہوتے ہیں، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو سکے۔ فطرت کا یہ قانون جس طرح بقیہ دنیا میں کارفرما ہے اسی طرح وہ انسانی زندگی میں بھی کام کر رہا ہے۔

نزاع کے ابتدائی مرحلہ میں فیصلہ کا اپنے اختیار میں ہونا بہت سے اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ مختلف اسباب کی یکجائی اس کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے حق میں ایک مفید فیصلہ لے سکے۔ لیکن اگر وہ بروقت فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تو یہ اسباب بہت جلد منتشر ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ حالات کا سرا آدمی کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی صابرانہ روش اختیار کر کے آنے والے وقت کا انتظار کرے جب کہ دوبارہ ایسے اسباب اکٹھا ہوں جو اس کو از سر نو اپنا مطلوب فیصلہ لینے کا موقع دے سکیں۔ فیصلہ کے وقت چوک جانا اگر غلطی ہے تو مشتے بعد از جنگ غلطی پر دیوانگی کا اضافہ۔

دل جیتنا

زندگی کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے کہ —— جیسا دینا ویسا پانا۔ اگر آپ دوسروں کو نفرت دے رہے ہوں تو آپ کو بھی دوسروں سے نفرت ملے گی۔ اگر آپ کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے محبت کا تحفہ ہے تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو محبت کا تحفہ دیا جائے گا۔ اگر آپ اپنے سماج میں مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہوں تو پورا سماج آپ کو اپنے سردار کے روپ میں دیکھنے لگے گا۔

خدا نے خدمت اور نفع بخشی میں بے پناہ کشش رکھی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکے۔ ایسا آدمی لوگوں کے درمیان اپنے آپ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کو دوسروں سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو وہ چاہتا تھا، کیوں کہ اس نے بھی دوسروں کو وہ سب کچھ دے دیا تھا جن کو وہ اپنے لئے چاہتے تھے۔

دوسروں کے خیر خواہ بن جائیے اور پھر آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ دوسروں کے کام آئیے اور پھر آپ کا بھی کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہے گا۔

اس دنیا میں ہر آدمی مجبور ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے، یہاں کسی کے لئے بھی تنہا زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہنے کا کامیاب طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگوں کو جھکانے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ خود جھک جائیے۔ لوگوں سے لینے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ دینے والے بنئے۔ شکایتوں کو مسئلہ نہ بنائیے بلکہ شکایتوں کو بھول جائیے۔ اختلاف کو ٹکراؤ کا موضوع نہ بنائیے بلکہ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے۔ کوئی شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آئے تب بھی اس سے نفرت نہ کیجئے۔ یہی دل کو جیتنے کا طریقہ ہے اور جب دل کو جیت لیا جائے تو اس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لئے باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ اور غم

کوئی آدمی جب بھی کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے تو ایسا ہمیشہ فطرت کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ کو اپنے لئے ایک غم بنالینا یہ انسان کا اپنا اضافہ ہے۔ ابتدائی طور پر کوئی مسئلہ صرف ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ مسئلہ پیش آنے پر غم میں مبتلا ہو جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے فطرت کے واقعہ پر اپنی طرف سے ایک غیر مطلوب اضافہ کر دیا۔

مسائل کے مقابلہ میں یہی انسان کی اصل غلطی ہے۔ یہ غلطی بے حد سنگین ہے کیونکہ وہ مسئلہ کے حل میں معاون تو نہیں بنتی، البتہ وہ اس کے حل میں ایک فیصلہ کن رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی رسی میں گرہ پڑنے کے بعد اس کو اور زیادہ کس دیا جائے۔

آدمی کو یہ بات جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے یہاں بہت سے دوسرے لوگ ہیں جن کے درمیان اس کو زندگی گزارنا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت گویا ایک بہت بڑی مشین کے اندر ایک چھوٹے پرزہ کی ہے یا وہ ایک بے حد مصروف سڑک پر ایک راہگیر ہے۔

انسانی زندگی کی یہی مخصوص نوعیت ہے جو مسائل پیدا کرتی ہے۔ یہ مسائل کبھی عالمِ فطرت کی طرف سے پیش آتے ہیں اور کبھی دوسرے انسانوں کی طرف سے۔ دونوں حالتوں میں مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ضبط و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے۔ مسئلہ کو غم کا سوال بنانے کے بجائے اس کو تدبیر کا سوال بنایا جائے۔ مسئلہ پیش آجانے کے بعد اگر آپ صبر و تحمل کا ثبوت دیں تو آپ کی دلجمعی اور آپ کا ذہنی سکون باقی رہے گا۔ آپ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ آپ اپنی پوری صلاحیت کو پیش آمدہ مسئلہ کے حل کے لئے استعمال کر سکیں۔ اور اگر ایسا ہو کہ آپ مسئلہ پیش آنے کے بعد غم میں مبتلا ہو کر اس کو اپنے لئے دردسر بنالیں تو مسئلہ کے مقابلہ میں آپ اپنا ضروری حصہ ادا کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے اپنے حریف کو خود سے بلا مقابلہ جیت (unopposed victory) کا موقع دے دیا جائے۔

سکون مطلوب نہیں

ایک کہاوت ہے کہ جہاز بندرگاہ میں زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ مگر جہاز اس لئے نہیں بنائے گئے کہ وہ بندرگاہ میں کھڑے رہیں:

Ships are safer in the harbour, but
they are not meant for that purpose.

انسان اگر اپنے ٹھکانے پر بیٹھا رہے، وہ نہ سفر کرے، نہ کوئی کام شروع کرے، نہ کسی سے معاملہ کرے، تو ایسا آدمی بظاہر محفوظ اور پرسکون ہوگا۔ مگر انسان کو پیدا کرنے والے نے اس کو اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ پرسکون طور پر ایک جگہ رہے اور پھر وہ مر کر قبر میں چلا جائے۔

انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کام کرے۔ وہ دنیا میں ایک زندگی کی تعمیر کرے۔ اس مقصد کے لئے اس کو دنیا کے ہنگاموں میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہ ہارنے اور جیتنے کے تجربات اٹھائے گا۔ اس کو کبھی نقصان ہوگا اور کبھی فائدہ۔ اس قسم کے واقعات کا پیش آنا عین فطری ہے۔ اور ایسے واقعات وحوادث کا اندیشہ ہونے کے باوجود انسان کے لئے یہ مطلوب ہے کہ وہ زندگی کے سمندر میں داخل ہو اور اپنی جدوجہد میں کمی نہ کرے۔

مزید یہ کہ پرسکون زندگی کوئی مطلوب زندگی نہیں۔ کیوں کہ جو آدمی مستقل طور پر سکون کی حالت میں ہو اس کا ارتقاء رک جائے گا۔ ایسے آدمی کے امکانات بیدار نہیں ہوں گے۔ ایسے آدمی کی فطرت میں چھپے ہوئے خزانے باہر آنے کا موقع نہ پاسکیں گے۔

اس کے برعکس ایک آدمی جب زندگی کے طوفان میں داخل ہوتا ہے تو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ ایک چھوٹا سا بیج تھا تو اب وہ ایک عظیم الشان درخت بن جاتا ہے۔

زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ زندگی یہ ہے کہ آدمی مقابلہ کر کے آگے بڑھے۔ زندگی وہ ہے جو سیلاب بن جائے نہ کہ وہ جو ساحل پر ٹھہری رہے۔

مخلص، غیر مخلص

دو لکڑی بظاہر ایک سائز کی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی قسم کا رنگ لگا ہوا ہے۔ مگر ان میں سے ایک اندر سے دیمک زدہ ہے، اور دوسری پوری طرح پختہ اور سالم ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں دنوں بظاہر یکساں معلوم ہوں گی۔ لیکن استعمال کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہوں گی۔ دیمک زدہ لکڑی پر جب کوئی بوجھ رکھا جائے گا تو وہ فوراً ٹوٹ جائے گی۔ اس کے برعکس پختہ لکڑی ہر بوجھ اٹھائے گی، وہ ہر استعمال میں مضبوط اور قابل اعتماد ثابت ہوگی۔

اس مثال سے مخلص انسان اور غیر مخلص انسان کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مخلص انسان ہر آزمائش میں پختہ لکڑی ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر مخلص انسان پر جب کسی آزمائش کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دیمک زدہ لکڑی تھا۔ وہ باہر سے کچھ تھا اور اندر سے کچھ۔

مخلص انسان جو لفظ بولتا ہے وہ عمل کے وقت ٹھیک ویسا ہی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جب کسی سے وعدہ کرتا ہے تو ٹھیک اپنے وعدہ کے مطابق اس کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کو جب کوئی امانت سونپی جاتی ہے تو تجربہ کے وقت وہ پوری طرح امین ثابت ہوتا ہے۔ اس کے اوپر جب کسی کا حق آتا ہے تو وہ کسی عذر کے بغیر صاحب حق کو اسے ادا کر دیتا ہے۔ خواہش اور انانیت اس کو سرکش نہیں بناتی۔ دنیوی مفادات اس کو حق کے راستہ سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

غیر مخلص انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ کو عمل کے وقت یاد نہیں رکھتا۔ وہ زور وشور کے ساتھ لوگوں سے وعدہ کرتا ہے مگر وہ اپنے وعدہ کو کبھی پورا نہیں کرتا۔ اس کو جب کسی چیز کا امانت دار بنایا جائے تو وہ پہلے ہی موقع پر خیانت پر اتر آتا ہے۔

مخلص اور غیر مخلص کا یہ فرق کوئی سادہ فرق نہیں۔ یہ وہ اہم ترین فرق ہے جو انسان کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔ موجودہ دنیا کی تمام حقیقی کامیابی صرف اس انسان کے لئے ہیں جو فی الواقع ایک مخلص انسان ہو۔ یہی وہ انسان ہے جو موت کے بعد کی زندگی میں ابدی سعادتوں سے نوازا جائے گا۔

امتحان کا پرچہ

ایک آدمی کے سامنے گلاب کا ایک درخت ہے۔ وہ اس کا خوبصورت پھول توڑنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تیزی کرے اور جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پھول توڑے تو عین ممکن ہے کہ اس کا ہاتھ زخمی ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ گلاب کے درخت کی شکایت کرے یا باغ کے مالی سے الجھ جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ مسئلہ باغ کا مالی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ وہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ مذکورہ شخص کی غلطی یہ ہے کہ وہ بے صبری کر کے فطرت سے ٹکرا گیا۔ حالانکہ فطرت سے ٹکرا کر کوئی بھی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ صرف گلاب کے پودے کا معاملہ نہیں بلکہ یہی پوری دنیا کا معاملہ ہے۔ جس طرح گلاب کے پیڑ میں پھول بھی ہیں اور اسی کے ساتھ کانٹے بھی، اسی طرح دنیا میں ہر طرف مسائل بھی ہیں اور مواقع بھی۔ جو لوگ مسائل میں اپنے آپ کو الجھائیں ان کی مثال اس نادان شخص کی سی ہے جو گلاب کے پیڑ میں کانٹے کو دیکھے اور اس سے الجھ جائے۔ اس کے برعکس جو لوگ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کریں وہ اس دانش مند کی طرح ہیں جو اپنے آپ کو کانٹوں سے بچائے اور احتیاط کے ساتھ پھول کو حاصل کر لے۔

دنیا کی یہ صورت حال اتفاقی نہیں ہے۔ یہ خود اللہ کے منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ اللہ نے انسان کو آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ پوری دنیا اسی کے مطابق بنائی گئی ہے۔ دنیا میں پھول کے ساتھ کانٹے ہونا یا مواقع کے ساتھ مسائل کا پایا جانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ انسان کے لئے آزمائش کا پرچہ ہے۔ انسان کا خالق یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو اپنے آپ کو منفی جذبات سے بچاتا ہے اور اپنے اندر مثبت نفسیات کی پرورش کرتا ہے۔ خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو منفی حالات میں بھی مثبت طرز فکر کا ثبوت دے، جو اشتعال والے حالات میں بھی مشتعل ہوئے بغیر رہ سکے۔

علم کی اہمیت

قدیم زَرعی دور میں علم کی اہمیت زیادہ تر فلسفہ اور مذہب کے مَباحث میں ہوتی تھی۔ موجودہ سائنسی دَور میں ہر چیز کا تعلق علم سے ہوگیا ہے۔ آج علم کے بغیر کسی بھی قسم کی ترقی ممکن نہیں ہے، نہ زرعی میدان میں اور نہ صنعتی میدان میں، نہ کسی اور میدان میں۔

موجودہ زمانے میں کوئی شخص پچھڑا ہوا دکھائی دے تو اس کے پچھڑے پن کا سبب علم سے محرومی ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ترقی کرتا ہوا دکھائی دے تو اُس کا سبب بھی یہ ہوگا کہ اُس شخص نے علمی قابلیت حاصل کی۔

قدیم زمانے میں ترقی کے لیے صرف محنت کافی ہوتی تھی مگر موجودہ زمانے میں محنت کے ساتھ پلاننگ ضروری ہوگئی ہے۔ آج کمیونکیشن نے پوری دُنیا کو ایک دوسرے سے قریب کردیا ہے۔ ایسی حالت میں بڑی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کو عالمی واقفیت حاصل ہو۔ اسی طرح آج ایک سُوئی یا ایک قلم بنانا ہو تب بھی اس کے لیے جدید ٹکنالوجی ضروری ہوتی ہے۔ پچھلے زمانے میں ایک کاغذی تحریر کی مزید نقل درکار ہو تو اس کو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا، مگر آج مزید نقل کا تعلق بھی ٹکنالوجی سے ہوگیا ہے۔

زمانے کی یہ تبدیلی بتاتی ہے کہ آج جو شخص ترقی کرنا چاہتا ہو اُس کو سب سے پہلے علم حاصل کرنا پڑے گا ورنہ وہ دنیا کے بازار میں بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

علم کے ذریعہ آدمی اِس قابل بنتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے خیالات سے مستفید ہو سکے۔ علم کے ذریعے آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ دنیا بھر کی معلومات حاصل کر سکے۔ علم کے ذریعہ آدمی کے اندر یہ مہارت پیدا ہوتی ہے کہ وہ جدید دفتری نظام کو سمجھے اور اس کو کامیابی کے ساتھ چلا سکے۔ علم کے ذریعہ آدمی اس قابل بنتا ہے کہ وہ جدید امکانات کو جانے اور ان کو اپنے حق میں استعمال کر سکے۔ موجودہ زمانے میں علم کے ساتھ ترقی اسی طرح جُوگئی ہے جس طرح قدیم زمانہ میں معیشت زمین کے ساتھ جُڑی ہوئی تھی۔

دانش مند کون

ایک برطانوی مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) کا قول ہے کہ ـــــــــ
دانش مند وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اس قول کا مطلب کیا ہے اس کو مثال سے سمجھئے۔ ایک طالب علم کو امتحان دینا ہے۔ وہ وقت کے مطابق اپنے گھر سے اسکول کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ راستہ میں ایک جاہل لڑکا اس سے الجھ جاتا ہے اور اس کو گالی دیتا ہے جس کے نتیجہ میں طالب علم کو غصہ آجاتا ہے۔

اب طالب علم اگر غصہ ہو جائے اور مذکورہ لڑکے سے انتقام لینے کے لئے اس سے الجھ جائے تو عین ممکن ہے کہ اس جھگڑے میں اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ وہ وقت پر امتحان ہال تک نہ پہنچے اور نتیجۃً اس کا ایک سال ضائع ہو جائے۔

اسی طرح ایک شخص کو ضروری سفر کرنا ہے۔ وہ گھر سے روانہ ہوتا ہے تاکہ ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ٹرین پر سوار ہو کر وقت پر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلا تو راستہ میں ایک شخص سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اب اگر وہ دیر تک اس آدمی سے جھگڑتا رہے تو عین ممکن ہے کہ اس کو اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اس کو معلوم ہو کہ اس کی ٹرین چلی گئی۔

ان مثالوں پر غور کیجئے۔ مذکورہ دونوں شخصوں کا ایک مسئلہ وہ تھا جو خود مقام واقعہ پر موجود تھا۔ یعنی ایک شخص کا انھیں گالی دینا یا زیادتی کرنا۔ یہ معاملہ کا وہ پہلو تھا جو براہ راست عین موقع کے وقت دکھائی دے رہا تھا۔ اسی کے ساتھ وہاں ایک چھپا ہوا پہلو بھی تھا جو بظاہر مقام واقعہ پر موجود نہ تھا مگر ایک صاحب بصیرت آدمی غور کر کے اسے جان سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اگر ان جاہلوں سے ٹکراؤ کیا جائے اور ان کو سزا دینے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک اور انتہائی اہم مصلحت تباہ ہو جائے گی۔ یعنی وقت پر امتحان ہال یا ریلوے اسٹیشن نہ پہنچنا اور محض ایک وقتی نوعیت کی جذباتی تسکین کی خاطر زیادہ

بڑے فائدہ سے اپنے آپ کو محروم کر لینا۔

مذکورہ قول میں اسی دوسرے یا بظاہر دکھائی نہ دینے والے پہلو کو معاملہ کا اضافی پہلو کہا گیا ہے۔ معاملہ کا ابتدائی پہلو، یعنی زیادتی کرنے والے کی زیادتی، ہر آنکھ والا دیکھتا ہے مگر معاملہ کے دوسرے پہلو یا اضافی قدر (relative value) کو وہی شخص دیکھے گا جو گہری بصیرت کا حامل ہو اور اپنے اقدام کا فیصلہ عقلی غور وفکر کے تحت کرتا ہو نہ کہ محض وقتی جذبات کے تحت۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں اکثر معاملات میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ غیر دانش مند آدمی صرف سامنے کی صورت حال کو دیکھ پاتا ہے اور اس کے مطابق کارروائی کرکے اپنے معاملے کو بگاڑ لیتا ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے جو معاملہ کے دیگر پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ جو سامنے کی صورت حال سے اوپر اٹھ کر ان حقیقتوں کا ادراک کر لے جو اگر چہ مقام واقعہ پر موجود نہیں مگر آخر کار ظاہر ہو کر وہی فیصلہ کن بن جائیں گی۔

موجودہ دنیا اسی دانش مندی کا امتحان ہے۔ جو آدمی اس اعتبار سے دانش مند ثابت ہو وہی اس دنیا میں کامیاب ہوگا۔ اور جو آدمی اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

تجزیاتی اسلوب، شاعرانہ اسلوب

تجزیاتی اسلوب کیا ہے اور تخیلاتی اسلوب کیا ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شاعر گلاب کے درخت کو دیکھتا ہے۔ اس کی شاخ میں لطیف پھول کے ساتھ کانٹے بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر شاعر کے ذہن میں ایک خیالی مضمون آتا ہے۔ وہ اس مضمون کو ایک شعر کے روپ میں اس طرح ڈھال دیتا ہے:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے　　اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

اس شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ محض خیال آرائی ہے۔ اس لئے کہ گلاب کے کانٹوں نے کبھی بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ دفاعی فوج بن کر پھول کی حفاظت کریں۔ جب بھی کوئی شخص پھول توڑنا چاہتا ہے تو وہ نہایت آسانی سے پھول کو توڑ لیتا ہے اور شاخ میں لگے ہوئے کانٹے بدستور غیر متحرک حالت میں پڑے رہتے ہیں۔

البتہ پھول کا حسن خود اپنی ذات میں پھول کی حفاظت ہے۔ جب بھی کوئی شریر بچہ یا کوئی بے حس آدمی پھول کو توڑنا چاہتا ہے تو تمام باذوق افراد پھول کی حمایت میں بولنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھول کو توڑ کر اس کو برباد نہ کرو بلکہ اس کے حسن سے تم خود بھی محظوظ ہو اور دوسروں کو بھی اس سے محظوظ ہونے کا موقع دو۔ ہر پھول جو اپنی شاخ میں کھل کر اپنی بہار دکھاتا ہے وہ خود اپنے حسن کی بدولت زمین کی زینت بنتا ہے نہ کہ کانٹوں کی حفاظت کی بدولت۔

گلاب کے پھول کے واقعہ کو اگر آپ تجزیاتی نظر سے دیکھیں تو آپ کو اس میں یہ سبق ملے گا کہ اس دنیا میں کوئی آدمی اگر اپنے اندر کوئی خوبی یا نفع بخشی پیدا کر لے تو اس کی یہ صفت اپنے آپ اس کی حفاظت کی ضمانت بن جائے گی۔ لیکن اسی واقعہ کو اگر تخیلاتی نظر سے دیکھا جائے تو دیکھنے والا نہ اس کی اصل حقیقت کو سمجھے گا اور نہ وہ اس سے کوئی نصیحت لینے میں کامیاب ہو سکے گا۔ تجزیاتی طریقہ آدمی کے شعور کو جگاتا ہے اور تخیلاتی طریقہ آدمی کو بے شعوری کے اندھیرے میں گم ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

اول دن

زکام شروع ہونے سے پہلے اس کی کچھ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں مثلاً چھینک آنا۔ زکام کی ابتدائی علامت ظاہر ہوتے ہی اگر فوری طور پر دوالی جائے تو پہلی ہی خوراک میں زکام کنٹرول میں آجائے گا لیکن اگر دیر کی جائے تو لمبی مدت تک زکام آپ کو پریشان کرتا رہے گا۔ یہی دوسری بیماریوں کا معاملہ ہے۔

زندگی کے مسائل و معاملات کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اس بات کو فارسی زبان کی ایک مثل میں اس طرح کہا گیا ہے: گربہ کشتن روزِ اول (بلی کو پہلے ہی دن ہلاک کرو) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص سے تمہاری نزاع ہو یا اس سے دشمنی ہو جائے تو ابتداء ہی میں اس کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ حتی کہ فریق ثانی کی شرطوں پر اگر معاملہ ختم ہوتا ہو تب بھی اس میں دیر نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح کے معاملات میں دیر کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ معاملہ کی پیچیدگی بڑھتی چلی جائے۔ نزاعی مسئلہ ابتدائی مرحلہ میں تھوڑی قیمت پر حل ہو جاتا ہے۔ جب کہ بعد کو بھاری قیمت دے کر اسے حل کرنا پڑتا ہے۔

اس اصول پر عمل نہ کرنے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ نزاع پیش آنے کے بعد صاحب معاملہ معتدل ذہنی حالت میں نہیں رہتا۔ اس لئے وہ بے لاگ فیصلہ کرنے میں عاجز ثابت ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ معاملہ پیش آنے کے بعد لوگوں سے مشورہ کیا جائے اور جو مشورہ ملے اس پر کھلے ذہن کے ساتھ غور کیا جائے۔ مشورہ کے ذریعہ وہ درست رائے معلوم ہو جاتی ہے جس کو صاحب معاملہ اپنے متاثر ذہن کی بنا پر دریافت نہیں کرسکا تھا۔

نزاع کا جاری رہنا کسی بھی فریق کے لئے مفید نہیں۔ اگر فریق ثانی ضد کا طریقہ اختیار کرے تب بھی ایک فریق کو یک طرفہ طور پر اسے ختم کر دینا چاہئے۔ جو فریق نزاع کے خاتمہ کی پہل کرے گا آخر کار وہ کامیاب ہوگا۔

محبت فاتح عالم

محبت ایک طاقت ہے۔ وہ کسی ہتھیار کے بغیر لوگوں کو فتح کر لیتی ہے۔ ہتھیاروں کا وار انسان کے جسم پر ہوتا ہے اور محبت کا وار انسان کے دل پر۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہتھیار زیادہ طاقت ور ہے جو دل کو جیت لے۔ جسم کو ہرانے والا ہتھیار مقابلۃً بے حد کمزور ہے اور اسی کے ساتھ نہایت وقتی بھی۔

محبت کا یہ اصول زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ گھر میں ہوں یا پڑوس میں۔ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ ہر موقع پر ایسے معاملات پیش آتے ہیں جب کہ آپ کو دوسرے سے کوئی اختلاف یا شکایت ہو جائے۔ ایسے موقع پر اگر آپ ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر دونوں فریقوں کے درمیان نفرت اور ضد بڑھے گی۔ اور نفرت اور ضد معاملہ کو صرف بڑھاتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں معاملہ کو گھٹانے والی یا اس کو حل کرنے والی نہیں۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ جب کسی سے شکایت یا اختلاف کی صورت پیش آئے تو آپ ردّ عمل کی نفسیات کا شکار نہ ہوں۔ آپ فریق ثانی کے رویہ سے اوپر اٹھ کر اس کے ساتھ نرمی اور محبت کا معاملہ کریں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ دیکھیں گے کہ معاملہ جہاں پیدا ہوا تھا وہیں وہ ختم ہو گیا۔ جو اختلاف بظاہر دوری کا سبب بننے والا تھا وہ قربت بڑھانے کا ذریعہ بن گیا۔

کوئی شخص آپ سے کڑوا بول بولے تو آپ اس کا جواب میٹھے بول سے دیجئے۔ کوئی شخص آپ کو اپنے لئے مسئلہ سمجھے تو آپ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو بے مسئلہ بنا لیجئے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ بدمعاملگی کرے تو آپ اس کے ساتھ اچھے برتاؤ کا ثبوت دیجئے۔ کوئی شخص آپ کو بدنام کرے تو آپ اس کا تذکرہ اچھے الفاظ کے ساتھ کیجئے۔ کوئی شخص آپ پر غصہ ہو جائے تو آپ اس کے لئے برف کی طرح ٹھنڈے پڑ جائیے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ بدخواہی کرے تو آپ اس کے حق میں خیر خواہ بن جائیے۔ یہی محبت کا طریقہ ہے، اور محبت بلاشبہ فاتح عالم ہے۔

دو قسم کے آدمی

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک انسان وہ ہے جو اصول کے بارے میں حساس ہو۔دوسرا وہ جس کی حساسیت صرف اپنی خواہشات اور مفادات کے بارے میں جاگتی ہو۔پہلی قسم کے انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہیں اور دوسری قسم کے لوگ انسان نما حیوان ہیں۔ان کے جینے کی سطح اور حیوانوں کے جینے کی سطح میں کوئی فرق نہیں۔

ایک انسان وہ ہے جو ہر حال میں حق کا اعتراف کرے،خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔وہ اپنے کئے ہوئے وعدہ سے کبھی نہ پھرے،وہ کسی حال میں سچائی کو نہ چھوڑے،خواہ وہ اس کی مصلحتوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔اس کا کردار اصول انسانیت کے تابع ہو نہ کہ حالات اور مواقع کے تابع۔وہ وہی کرے جو اسے کرنا چاہئے،نہ کہ وہ جس کو کرنے کے لئے اس کا جی چاہتا ہو۔

دوسرا انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو کسی اصول یا معیار کا پابند نہ سمجھے۔حالات کا دباؤ ہو تو حق پرست بن جائے اور جہاں دباؤ نہ ہو وہاں وہ حق کو نظر انداز کردے۔وعدہ پورا کرنے میں فائدہ نظر آئے تو وعدہ پورا کرے اور جہاں فائدہ کا محرک نہ ہو وہاں وعدہ سے بے پروا ہو جائے۔ایک ہی قسم کے معاملہ میں اس کا رویہ ایک شخص کے ساتھ کچھ ہو اور دوسرے شخص کے ساتھ کچھ۔

بظاہر دیکھنے میں ہر آدمی ایک ہی شکل کا دکھائی دیتا ہے مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یکساں شکل کے اندر دو الگ الگ انسان چھپے ہوئے تھے۔مومن بااصول انسان کا نام ہے اور غیر مومن بے اصول انسان کا نام۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو مومن کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کا حامل ہو۔اس کی اصول پسندی کی بنا پر اس کے بارے میں پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جاسکے کہ کن حالات میں وہ کس قسم کے رویہ کا اظہار کرے گا۔

پختگی کیا ہے

پختگی یہ ہے کہ آدمی اپنے غصہ پر قابو پالے اور اختلافات کو تشدد اور تخریب کے بغیر دور کر سکے۔ پختگی تحمل اور برداشت کا نام ہے اور اس صلاحیت کا کہ وقتی خوشی کو دیر طلب مقاصد کے لیے قربان کر دیا جائے۔ پختگی اس استعداد کا نام ہے کہ کسی تلخی کے بغیر، ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ شخص یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"۔ پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پُر امن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

Maturity is the ability to control anger, and settle differences without violence or destruction. Maturity is patience, the willingness to give up immediate pleasure in favour of the long-term gain. Maturity is the capacity to face unpleasantness and disappointment without becoming bitter. Maturity is humility. A mature person is able to say, "I was wrong". Maturity is the ability to live in peace with things we can not change.

پختگی دراصل حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ وہ ساری صفتیں جن کو پختگی کہا جاتا ہے وہ سب حقیقت واقعہ کے اعتراف سے پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جانے کہ کہاں اس کی حد ختم ہوتی ہے اور کہاں سے دوسری طاقتوں کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق، اُس کے لیے ممکن ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق، اس کے لیے ممکن نہیں۔ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اقدام سے پہلے اُس کے انجام کو سوچے، وہ اپنے عمل کی نتیجہ خیز منصوبہ بندی کرے۔

حقیقت واقعہ کا اعتراف آدمی کے اندر یہ بصیرت پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرے۔ وہ یہ جانے کہ کیا چیز اُس کے لیے قابلِ حصول ہے اور کیا چیز اُس کے لیے قابل حصول نہیں۔ پختہ انسان ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور بالفرض اگر وہ کسی معاملہ میں کامیاب نہ ہو تو وہ اپنی

ناکامی سے سبق لے کر اپنے آپ کو زیادہ صاحب بصیرت بنا لیتا ہے، اور اسی کے ساتھ زیادہ طاقتور بھی۔ پختگی کسی انسان کی نہایت اعلیٰ صفت ہے۔

پختہ (mature) کی تعریف ڈکشنری میں اس طرح کی گئی ہے — ایک وجود جس کا نشو ونما پوری طرح ہوا ہو، وہ اپنی ترقی کے کمال تک پہنچا ہو:

A being full-grown, or fully developed.

ایک درخت کی پختگی یہ ہے کہ وہ ابتدائی درجہ سے شروع ہو کر پھول اور پھل کے آخری درجہ تک پہنچ جائے، وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل درخت بن جائے۔ اسی طرح انسان کی پختگی یہ ہے کہ وہ اپنی عقلی صلاحیت کے اعتبار سے آخری درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔

تاہم انسان کی پختگی کا تعلق صرف حیاتیات یا نفسیات سے نہیں ہے بلکہ اُس کا گہرا تعلق علم سے ہے۔ جو آدمی اپنے علم کو بڑھائے، جو تجربات سے سبق سیکھے، جو دنیا سے معرفت کا رزق لے کر اپنے ذہنی وجود کو مکمل کرے، وہ گویا پختگی کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچا۔

پختہ انسان صاحبِ بصیرت انسان ہوتا ہے۔ پختہ انسان اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ وہ معاملات میں صحیح رائے قائم کرے۔ غیر پختہ انسان خوش فہمیوں میں جیتا ہے اور پختہ انسان حقائق میں۔ غیر پختہ انسان جذباتی فیصلہ کرتا ہے اور پختہ انسان جذبات سے اوپر اٹھ کر اپنی رائے بناتا ہے۔ غیر پختہ انسان کا اقدام جلد بازی کا اقدام ہوتا ہے اور پختہ انسان کا اقدام سوچا سمجھا ہوا اقدام۔ غیر پختہ انسان کا طریقہ لڑائی بھڑائی کا طریقہ ہوتا ہے اور پختہ انسان کا طریقہ صبر اور تحمل کا طریقہ۔ غیر پختہ انسان متشددانہ طریقِ کار میں یقین رکھتا ہے اور پختہ انسان پُرامن طریقِ کار میں۔

غیر پختہ انسان اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ اپنی غلطی سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔ اس کے برعکس پختہ انسان جب کوئی غلطی کرتا ہے تو فوراً ہی وہ کھلے دل سے اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ غلطی کا یہ اعتراف اُس کے لیے اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ وہ ہر تجربہ سے سبق سیکھے۔ وہ اپنی شخصیت کو بہتر سے بہتر بناتا رہے۔ اُس کا ذہنی ارتقاء کسی رکاوٹ کے بغیر مسلسل جاری رہے۔

شکستِ تاریخ

گورنمنٹ سروس میں ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کو شکست ملازمت (break in service) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ دس سال سے ملازت میں ہیں اور ایک دن چھٹی لیے بغیر دفتر میں حاضر نہ ہوں تو آپ کی مدت ملازمت کا شمار از سرِ نو اگلے دن سے ہوگا۔ پچھلے دس سال کی مدت حذف قرار پائے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ کی سینیر یٹی کا تعین پچھلے دس سال کو چھوڑ کر کیا جائے گا۔ یہ سرکاری ملازمین کے لیے ایک سخت سزا ہے۔ وہ کسی ایسی غلطی کا تحمل نہیں کرسکتا جو اس کے لیے شکست ملازمت کا سبب بن جائے۔ اس لیے ہر ملازم آخری حد تک یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ شکستِ ملازمت کے اس قانون کی زد میں نہ آئے۔

اسی طرح ایک اور چیز ہے جس کو شکستِ تاریخ (break in history) کہا جا سکتا ہے۔ ہر آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ ایک تاریخ بناتا ہے۔ اگر درمیان میں وہ اپنے پیشہ یا اپنے مقام کو بدل دے تو یہ اس کے لیے شکست تاریخ کے ہم معنٰی ہوگا۔ ایسی تبدیلی کے بعد وہ اپنی بنائی ہوئی تاریخ سے کٹ جائے گا۔ حالاں کہ عملی اعتبار سے زندگی کی کامیابی میں تاریخ کی بہت اہمیت ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ بہت زیادہ سوچ کر اپنی عملی زندگی کا آغاز کرے۔ وہ جب ایک کام شروع کردے تو اس کے بعد وہ اس کو ہرگز نہ چھوڑے۔ وہ اتار اور چڑھاؤ کو برداشت کرتے ہوئے اپنے کام میں لگا رہے۔ اسی استقلال کے نتیجہ کا نام کامیابی ہے۔ جو لوگ بار بار اپنے کام کو بدلیں وہ اپنی زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

آدمی کی تاریخ اس کا قیمتی اثاثہ ہے۔ اسی تاریخ سے سماج کے اندر اس کی پہچان بنتی ہے۔ اسی تاریخ سے اُس کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اسی تاریخ سے لوگوں کے نزدیک اُس کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ اسی تاریخ کے مطابق، لوگ اس سے معاملہ کرتے ہیں۔ یہ تاریخ لازمی طور پر تسلسل چاہتی ہے۔ جس تاریخ میں تسلسل نہ ہو وہ تاریخ ہی نہیں۔

توہین کا مسئلہ

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ توہین اسلام کا مسئلہ جانتے ہیں، مگر وہ توہین مسلم کا مسئلہ نہیں جانتے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کی توہین کردے تو تمام لوگ بھڑک اٹھیں گے اور اس کے خلاف پر جوش مہم شروع کردیں گے۔ لیکن ایک مسلمان ہر روز دوسرے مسلمان کی توہین کرتا ہے اور اس پر کوئی نہیں بھڑکتا، اس کو اس طرح نظر انداز کردیا جاتا ہے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ حالاں کہ شریعت کے مطابق، مومن کا اکرام فرض ہے اور مومن کی توہین حرام۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام کی توہین کرے تو ایسا واقعہ نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے قومی غیرت اور قومی فخر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے فخر کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلم کی توہین عملاً احتساب خویش کا مسئلہ ہے، اور احتساب خویش بلاشبہہ ان لوگوں کے اوپر بہت سخت ہے جو اپنے دل میں اللہ کا خوف نہیں رکھتے۔ اسلام اللہ کا آخری دین ہے۔ اللہ نے اس کے لئے ابدی عظمت کا فیصلہ کردیا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اسلام کو زیر کرسکے۔ اسلام کا ابدی محافظ خود اللہ ہے، اور اللہ سے بڑا محافظ اور کون ہوسکتا ہے۔

مگر جہاں تک توہین مسلم کا معاملہ ہے اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ہے۔ مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ کسی مسلمان کی توہین نہ کریں۔ اور جب کوئی شخص ایک مسلمان کی توہین کرے تو اس کو ایسا کرنے سے روک دیں۔ جو مسلم معاشرہ اس روحِ احتساب سے خالی ہوجائے وہ اللہ کی رحمتوں سے بھی دور ہوجائے گا۔

اغیار کی طرف سے قومی فخر پر زد پڑے تو اس پر بھڑک اٹھنا اور جب خود اپنی اصلاح یا احتساب کا مسئلہ ہو تو اس پر بے حس بنے رہنا ایمان کی موت کی علامت ہے نہ کہ ایمان کی زندگی کی علامت۔

بھلانے کی ضرورت

خارش کو کھجانے سے خارش بڑھتی ہے۔ مگر جس آدمی کو خارش ہو وہ کھجائے بغیر نہیں رہتا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ تلخ تجربات کا ہے۔ تلخ تجربات کو یاد کرنا صرف نقصان میں اضافہ کرنا ہے۔ مگر اکثر لوگ تلخ تجربات کو اپنی یادوں سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ زندگی ایک اعتبار سے، ناخوش گوار واقعات کا دوسرا نام ہے۔ ایسی حالت میں تلخیوں کو اور ناخوش گواریوں کو یاد رکھنا اپنے ذہن پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ہے۔ جو قصہ ماضی میں پیش آیا اس کو حال میں یاد رکھنا صرف اپنے دکھ کا تسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کو کسی طرح عقل مندی نہیں کہا جاسکتا۔

آپ کے ساتھ برا سلوک دوسرا شخص کرتا ہے، مگر اس برے سلوک کی یاد خود آپ کے اختیار کی چیز ہے۔ پھر جو کچھ آپ کے دشمن نے کیا، وہی آپ خود اپنے خلاف کیوں کریں۔

ماضی کی تلخیوں کو یاد رکھنا آدمی کے ذہن کو منتشر کرتا ہے۔ وہ آدمی کی صحت کو برباد کرتا ہے۔ وہ آدمی سے اس کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کرسکے۔ پھر آدمی کیوں اپنے آپ کو اس دہرے نقصان میں مبتلا کرے۔

اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی یہ لازمی شرط ہے کہ آدمی بھلانے کی عادت ڈالے۔ وہ گزرے ہوئے تلخ تجربات کو بھول جائے۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے غم میں اپنے آپ کو نہ گھُلائے۔ لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں کو سن کر وہ اپنے سکون کو برہم نہ ہونے دے۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے غیر متاثر رہ کر اپنا کام کرنا، یہ زندگی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اور جو لوگ اس راز کو جانیں وہی اس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

کھوئے ہوئے کی تلافی اپنے اختیار میں نہیں، مگر کھوئے ہوئے کو بھلا دینا اپنے اختیار میں ہے۔ ناخوش گوار الفاظ کو فضا سے نکالنا اپنے اختیار میں نہیں، لیکن یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ ناخوش گوار الفاظ کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ پھر آپ کیوں نہ ایسا کریں کہ ناممکن سے اپنی توجہ کو ہٹالیں اور ممکن کے حصول کے لیے اپنی ساری توجہ لگادیں۔

دو لفظ

اگر موت کا فرشتہ آئے اور کہے کہ ہم تمہاری روح قبض کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اب تم کو صرف دو لفظ بولنے کا مزید موقع ہے۔ جو بھی دو لفظ تم کو کہنا ہے، کہہ دو، اس کے بعد تم کو اِس دنیا سے اٹھالیا جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو میں فوراً کہوں گا ——— خود احتسابی۔

خود احتسابی (self-criticism) میرے علم اور تجربہ کے مطابق، دانائی کا سب سے بڑا کلہ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ مادہ ہو کہ وہ اپنے اوپر تنقید کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس نظر سے دیکھے جس نظر سے اس کا خارجی محتسب اس کو دیکھتا ہے، وہ یقینی طور پر عارف بن جائے گا۔ وہ چیزوں کو ویسا دیکھنے لگے گا (as it is) کا ویسا۔ اور جو شخص اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلے، اس نے دنیا میں بھی کامیابی کا راز پالیا اور آخرت میں بھی کامیابی کا راز اس کو مل گیا۔

جو شخص اپنا احتساب کرے، دوسرا آدمی اس پر تنقید کرے تو وہ اس پر مشتعل نہ ہو بلکہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، وہ بلاشبہہ ایک عظیم انسان ہے۔ ایسا آدمی اس سے بچ جائے گا کہ وہ جھوٹے بھرم میں مبتلا ہو۔ وہ غیر حقیقی چیزوں کو حقیقی چیز سمجھ لے۔ وہ اپنی غلطیوں کو دہرانے سے محفوظ رہے گا۔ وہ فریب نفس کی بیماری میں مبتلا نہ ہوگا۔

خود احتسابی اس بات کا اعتراف ہے کہ میں انسان ہوں، میں خدا نہیں ہوں۔ وہ اس بات کا اعتراف ہے کہ حقیقت وہ ہے جو کہ ہے، نہ کہ وہ جس کو میں بطور خود حقیقت فرض کرلوں۔ خود احتسابی کی صفت آدمی کو انسانِ اصلی (man cut to size) بناتی ہے۔ وہ آدمی کو سچی معرفت تک پہنچانے والی ہے۔

جس آدمی کے اندر خود احتسابی کا مادہ نہ ہو، وہ لازمی طور پر جمود اور ٹھہراؤ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس خود احتسابی کا مادہ اس بات کا ضامن کہ آدمی مسلسل آگے بڑھتا رہے، اس کی ذہنی ترقی کا سفر کبھی ختم نہ ہو۔

خود احتسابی آدمی کو کامل انسان بناتی ہے۔ اور جس آدمی کے اندر خود احتسابی نہ ہو وہ ناقص انسان ہو کر رہ جائے گا۔

عاجلانہ اقدام

عاجلانہ اقدام ہر ایک کے لیے تباہ کُن اقدام ہے۔ خواہ فرد کا معاملہ ہو یا جماعت کا معاملہ، کسی کے لیے بھی عاجلانہ اقدام مفید نہیں ہوسکتا۔ عاجلانہ اقدام دراصل اندھیرے میں چھلانگ کے ہم معنی ہے، اور کوئی بھی شخص اتنا طاقتور نہیں کہ وہ اندھیرے میں چھلانگ لگائے اور پھر اُس کے نتائج وعواقب سے اپنے کو بچالے۔

ایک صاحب تھے۔ وہ کریلا سے چڑھتے تھے۔ اُن کے سامنے کوئی کریلا کا نام لے لے تو وہ بگڑ کر اُس کو بُرا بھلا کہنے لگتے تھے۔ اُن کو غصہ دلانے کے لیے اتنا کافی تھا کہ کوئی شخص اُن کے سامنے کریلا کا لفظ بول دے۔ چند لڑکوں کو خیال آیا کہ وہ مذکورہ صاحب کو چڑھائیں۔ وہ اُن کے پاس گئے۔ ہر لڑکے نے باری باری ایسا کیا کہ وہ ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا—— کریلا۔

مذکورہ صاحب اس پر سخت غصہ ہوئے۔ وہ اپنا ڈنڈا لے کر ان لڑکوں کی طرف دوڑے کہ انہیں ماریں۔ لڑکے تیزی سے بھاگنے لگے۔ اب صورت یہ تھی کہ لڑکے آگے بھاگ رہے ہیں اور مذکورہ صاحب اُن کے پیچھے لاٹھی لیے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ اس عمل کے دوران مذکورہ صاحب کی توجہ مکمل طور پر لڑکوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نیچے زمین کی طرف نہ دیکھ سکے۔ راستہ میں ایک مین ہول تھا جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ مذکورہ صاحب مین ہول کو نہ دیکھ سکے۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کے اندر گر گئے۔ اُن کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اُن کا پاؤں کبھی ٹھیک نہ ہوسکا۔ چنانچہ وہ ساری عمر لاٹھی لے کر چلتے رہے۔

یہ کہانی کسی ایک فرد کی کہانی نہیں۔ اکثر لوگ کسی نہ کسی طور پر اس قسم کی غلطی کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی افسوس کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غصہ ایک لمحہ میں ٹھنڈا ہوسکتا ہے، لیکن غصہ کا برا انجام ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے۔ وقتی طور پر ایک ناخوش گوار چیز کو برداشت کر لیجیے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ کو ساری عمر ناخوش گوار چیزوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔

وقت کی پابندی

ایک اسکول کے ٹیچر کا واقعہ ہے۔ اُن کا گھر اسکول سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ اُن کا معمول تھا کہ وہ گھر سے اسکول تک کا یہ فاصلہ رکشہ کے ذریعہ طے کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اُنہوں نے ایک رکشہ والے سے معاملہ طے کر رکھا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ رکشہ والا چند منٹ دیر سے پہنچا۔ مذکورہ ٹیچر وقت پر اپنے گھر سے نکلے اور جب اُنہوں نے رکشہ والے کو نہیں دیکھا تو انہوں نے طے کیا کہ وہ دوڑتے ہوئے اپنے اسکول جائیں گے۔ چنانچہ وقت پر اپنے گھر سے نکل کر دوڑتے ہوئے وہ اپنے اسکول کی طرف روانہ ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد رکشہ والا آیا۔ وہ تیزی سے رکشہ چلاتا ہوا ٹیچر کے پاس پہنچا اور کہا کہ آیئے رکشہ پر بیٹھ جایئے۔ مگر ٹیچر بدستور دوڑتے رہے۔ وہ آگے چل رہے تھے اور رکشہ اُن کے پیچھے۔ اسی حال میں چلتے ہوئے وہ اسکول پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رکشہ والے نے دوبارہ کبھی تاخیر نہ کی۔

وقت کی پابندی اتنی زیادہ اہم ہے کہ جس آدمی کے اندر وقت کی پابندی کی صفت نہ ہو وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں اصل ضرورت یہ ہے کہ آدمی وقت کے بارہ میں حسّاس ہو۔ وقت کو ضائع کرنے والے وہی لوگ ہیں جو وقت کے بارہ میں حسّاس نہ ہوں۔ جو آدمی وقت کی اہمیت کو جانتا ہو وہ اس معاملہ میں کبھی کوئی عذر پیش نہیں کرے گا۔ وہ ہر صورت حال میں اپنے وقت کو منظّم کرنے میں کامیاب رہے گا۔ وقت کی پابندی کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ ملے ہوئے وقت کو بھرپور طور پر استعمال کیا جائے۔

بعض لوگ وقت کی تنگی کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ بے معنی عذر ہے۔ اصل مسئلہ وقت کی تنگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ سوچ کی تنگی ہے۔ جس آدمی کا شعور اس معاملہ میں زندہ ہو وہ اپنے اوقات کی تنظیم اس طرح کرے گا کہ وہ کم وقت میں بھی زیادہ کام کر سکے۔ اسی حقیقت کو اسماعیل میرٹھی نے اپنے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ　　کھینچنے سے بڑھتی ہے، چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

اپنے کام سے کام

تقریباً پانچ سال پہلے دہلی میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ اُنہوں نے کمپیوٹر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اُن کے دو رشتہ داروں کے ساتھ میں اُن کے گھر پر ملا۔ اُس وقت وہ ایک سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔ ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹہ تک وہاں رہے۔ اس پورے وقت میں میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ نوجوان نہ صرف اپنے فن میں ایکسپرٹ ہے بلکہ اُس کے اندر ایک انوکھی صفت ہے۔ اس صفت کو ایک لفظ میں کہہ سکتے ہیں، اپنے کام سے کام۔ اُسی وقت میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ یہ نوجوان ضرور اعلیٰ ترقی کرے گا۔

۱۶ اکتوبر ۲۰۰۴ کے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ مذکورہ نوجوان کو ایک بین اقوامی ادارہ میں وائس چیرمین کی جگہ پر فائز کیا گیا ہے۔ اس وقت اُن کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہے۔

اپنے کام سے کام کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنے کام سے کام کا مطلب اپنے وقت اور اپنی طاقت کو بچانا ہے۔ اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ صلاحیتیں مفید طور پر استعمال ہوسکیں۔ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کا کوئی جزئی حصہ بھی کسی غیر ضروری کام میں ضائع نہ ہونے پائے۔

جس آدمی کے اندر اپنے کام سے کام کا مزاج ہو وہ دوسروں کے لیے آخری حد تک قابل قبول انسان بن جائے گا۔ وہ دوسروں کے خلاف نہیں بولے گا۔ وہ دوسروں کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ وہ دوسروں کے ساتھ اسی حالت میں تعاون کرنے پر راضی ہوجائے گا جس حالت میں کہ وہ ہیں۔ اسی طرح دوسرے بھی اُس کے ساتھ اُسی حالت میں تعاون کرنے پر راضی ہوجائیں گے جس حالت میں کہ وہ خود ہے۔

لوگ اس انسان کو پسند کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے مسئلہ پیدا کئے بغیر اپنا کام کرے اور جو آدمی اپنے کام سے کام رکھے وہ دوسروں کے لیے اسی قسم کا ایک پسندیدہ انسان بن جائے گا۔ اپنے کام سے کام رکھنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ زندگی کا ایک کامیاب اصول ہے۔ جو آدمی اس

اصول کو پوری طرح اپنا لے وہ اس دنیا میں کبھی نا کام نہیں ہوسکتا۔

اسی مزاج کا ایک اظہار وہ ہے جس کو اسٹیٹس کوازم (status quoism) کہا جاتا ہے۔ کسی مقصد میں کامیابی کے لیے اسٹیٹس کوازم واحد کارگر تدبیر ہے۔ اسٹیٹس کوازم کا مطلب ہے — حالتِ موجودہ سے ٹکرائے بغیر اپنا کام کرنا:

Doing one's Job without disturbing the existing state of affairs.

کام کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی سوچ یہ ہو کہ پہلے موجودہ صورتِ حال کو بدلو۔ اس کے بعد اپنا مطلوب کام شروع کرو۔ یہ راستہ منفی راستہ ہے۔ اس میں یہ نقصان ہے کہ آدمی اپنی قوت وطاقت کا بڑا حصہ غیر ضروری طور پر مفروضہ مشکلات کو دور کرنے میں لگا دیتا ہے۔ جب کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ اپنے کام سے کام کا مطلب اسی دوسرے طریقہ کو اختیار کرنا ہے۔

اسی دوسرے طریقہ کا نام اسٹیٹس کوازم ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کبھی مشکلات یا ناموافق باتوں سے خالی نہیں ہوسکتی۔ مشکلات کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ ایک مشکل کو ہٹاتے ہی دوسری مشکل سامنے آجاتی ہے اور دوبارہ وہی ناموافق صورت حال باقی رہتی ہے جو پہلے تھی۔ ایسی حالت میں عقلمندی یہ ہے کہ مشکلات ومسائل کو زندگی کا ایک لازمی حصہ سمجھا جائے اور اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مشکلات اور مسائل سے لڑنے والے لوگ ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں اور جو لوگ مشکلات ومسائل سے تعرض نہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کردیں، وہ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ یہ دنیا کسی ایک کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ سب کے لیے ہے۔ عقلمند آدمی وہ ہے جو یہ جانے کہ دنیا کی اس شاہراہ پر دوسروں کو راستہ دے کر ہی اپنا راستہ ملتا ہے۔۔ جو آدمی زندگی کی شاہراہ پر دوسروں کو راستہ دیے بغیر آگے بڑھنا چاہے اُس کے لیے جو چیز مقدر ہے وہ قبرستان ہے، نہ کہ مطلوب منزل۔ یہی فطرت کا قانون ہے اور یہی انسانی تاریخ کا فیصلہ بھی۔

نازک پارسل

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سامانوں کے بعض پارسل پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ احتیاط سے اٹھاؤ (handle with care)۔ یہ وہ پارسل ہیں جن میں کوئی نازک چیز (مثلاً شیشہ) پیک ہوتا ہے۔ اس طرح کے پارسلوں کے ساتھ اگر بے احتیاطی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کے اندر کا سامان ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے پارسلوں کے اوپر یہ ہدایت لکھ دی جاتی ہے کہ ان کو اٹھانے اور رکھنے میں احتیاط کرو۔

پارسلوں میں تو ایسے پارسل بہت کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ اس قسم کا نازک مسئلہ وابستہ ہو۔ مگر آج کل کے انسانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی قسم کے نازک پارسل بنے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی گویا مسٹر پرابلم (Mr Problem) یا مسٹر ہینڈل ودھ کیئر (Mr. Handle with care) بنا ہوا ہے۔

یہ وہ انسان ہیں جن کے ساتھ ذرا سا بھی کوئی خلاف مزاج بات پیش آ جائے تو وہ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خلاف اس قسم کی شکایتیں لیے پھرتے ہیں کہ اس نے یہ کہہ دیا، اس نے وہ کہہ دیا۔ ایسے لوگ خدا کی زمین پر بوجھ ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کوئی طاقتور سماج نہیں بن سکتا۔

حقیقی انسان وہ ہے جو لوہے کی مانند ہو۔ جس کو آہستہ رکھئے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے اور اگر زور سے پٹک دیجئے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے۔ وہ جھٹکوں سے غیر متاثر رہ کر جینا جانتا ہے۔ ایسے انسان کسی سماج کا بہترین سرمایہ ہیں۔ ایسے ہی افراد کے ذریعہ ایک صحت مند سماج وجود میں آتا ہے۔

کامیاب زندگی کے دو اصول ہیں۔ ایک یہ کہ آپ، بے مسئلہ انسان بن کر دنیا میں رہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کے لیے مسئلہ پیدا کرے تو آپ اس کو نظر انداز کر دیجئے۔ اس کے سوا کوئی تیسرا اصول نہیں جو اس دنیا میں کسی کو کامیاب کر سکے۔ کامیابی، ایک لفظ میں، کامیاب منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔

ایک غلطی

ایک انگریزی میگزین میں ایک لطیفہ نظر سے گذرا۔ پال نام کا ایک بچہ اپنے باپ کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اس نے مختلف قسم کے جانور دیکھے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے لیے ایک جانور خرید دیجئے۔ باپ نے کہا کہ اس کا کھانا ہم کہاں سے لائیں گے۔ بچہ نے جواب دیا کہ ان جانوروں میں سے ایک خرید دیجئے جن کے پنجرہ پر لکھا ہوا تھا کہ کھلانا نہیں ہے:

Paul went to the zoo with his father, "Buy an animal for me," he begged, "where would we get his food? asked the father. The boy replied,"Buy one of those where it says on the cage:'No feeding.'"

بچہ کی غلطی کیا تھی۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ پنجرہ کے بورڈ پر جو بات زائرین کی نسبت سے لکھی ہوئی تھی، اس نے اس کو خود جانوروں کی نسبت سے سمجھ لیا۔ اس واقعہ میں ایک نادان بچہ کا کلمہ تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑے لوگ بھی اسی نادانی میں مبتلا رہتے ہیں۔

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت یہ ہے کہ آپ معاملات میں صحیح فیصلہ کریں اور غلط فیصلہ سے بچیں۔ اس کا تعلق صحیح زاویہ نظر سے ہے۔ اگر آپ چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھیں تو آپ صحیح فیصلہ تک پہنچیں گے اور اگر آپ چیزوں کو غلط رخ سے دیکھیں تو آپ کا فیصلہ غلط ہو جائے گا۔ اور جب فیصلہ غلط ہو تو اقدام بھی ہمیشہ غلط ہو جاتا ہے۔

اس کی کیا تدبیر ہے کہ آدمی چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھے اور غلط رخ سے چیزوں کو نہ دیکھے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر بے لاگ سوچ پیدا کرے۔ وہ جذبات کے زیر اثر نہ سوچے۔ وہ متعصبانہ ذہن کے تحت اپنی رائے نہ بنائے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ چیزوں کو بے آمیز ذہن کے تحت دیکھنے لگے۔ وہ چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کے بعد ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے۔ ایسے ہی لوگ چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھیں گے اور وہ صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔

ترقی کا سیلاب

۱۰ اکتوبر ۲۰۰۴ کو پاکستان کے ایک مسلم دانشور سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ملک کی تقسیم نے پاکستان کے مسلمانوں کو خوشحال بنا دیا۔ مگر انڈیا کے مسلمان غریبی میں مبتلا رہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک غلط بات ہے۔ مزید یہ کہ وہ ایک خلاف زمانہ بات (anachronic statement) ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ایسا کیجئے کہ آپ دہلی کے مختلف علاقوں میں ایک سو مسلم خاندانوں کا سروے کیجئے۔ ان سے آپ یہ پوچھئے کہ ۱۹۴۷ میں ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا تھی اور آج ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا ہے۔ اسی طرح آپ لاہور کے مختلف علاقوں سے ایک سو مسلم خاندانوں کو لیجئے اور ان سے آپ یہی سوال کیجئے کہ ۱۹۴۷ میں ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا تھی اور آج ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا ہے۔ اگر آپ اس قسم کا سروے کریں تو آپ پائیں گے کہ دونوں جگہوں کے مسلمانوں نے تقریباً یکساں طور پر معاشی ترقی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن مسلم رہنماؤں نے معاشی ترقی کو منقسم ہندستان اور غیر منقسم ہندستان کا ظاہرہ سمجھا وہ ایک مہلک غلطی کا شکار ہوئے۔ اس غلطی کا سبب یہ تھا کہ وہ زمانی تبدیلی سے بے خبر تھے۔

اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان زرعی دور میں تھا۔ یہ مبنی بر زمین اقتصادیات (land-based economy) کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں پیسہ صرف لینڈ لارڈ کے پاس ہوتا تھا۔ بقیہ لوگ مجبور تھے کہ وہ غریبی کی حالت میں زندگی گزاریں۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد بقیہ دنیا کی طرح سارے برصغیر ہند میں صنعتی انقلاب شروع ہو گیا۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ ہر جگہ اقتصادی انفجار (economic explosion) آگیا۔ اب یہ ناممکن ہو گیا کہ پیسہ صرف ایک طبقہ کے پاس ہو اور دوسرے طبقات اس سے محروم رہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے سوکھے کا زمانہ ہو تو پانی صرف اس شخص کے پاس ہوگا جس کے پاس

کنواں ہو لیکن جب موسلا دھار بارش ہو جائے تو ہر جگہ پانی پھیل جائے گا۔ اب ہر آدمی اس پوزیشن میں ہوگا کہ وہ پانی حاصل کر سکے۔ یہی معاملہ قدیم زرعی دور اور جدید صنعتی دور کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ کسی کو ترقی کرنے سے روک دے۔ آج ہر طرف معاشی مواقع کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ آج کوئی شخص یا گروہ اپنی بے عملی سے اپنے آپ کو محروم بنا سکتا ہے لیکن جو لوگ عمل کرنے پر تیار ہوں ان کی معاشی ترقی میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

یہی غلط فہمی ایک اور معاملہ میں شدید تر صورت میں پیش آئی ہے۔ وہ یہ کہ سلطان ٹیپو سے لے کر یاسر عرفات تک تمام مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو باعزت زندگی گذارنے کے لیے سیاسی اقتدار ضروری ہے۔ جہاں سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو وہاں مسلمان باعزت طور پر زندگی نہیں گذار سکتے۔ یہ سوچ بھی ایک خلاف زمانہ بات (anachronic statement) کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسی دوررس تبدیلیاں پیش آئی ہیں جنہوں نے باعزت زندگی کے لیے سیاسی اقتدار کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ اب یہ پوری طرح ممکن ہو گیا ہے کہ کوئی گروہ سیاسی اقتدار کے بغیر عزت اور سر بلندی کی زندگی حاصل کر سکے۔

یہ امکان اُس جدید ظاہرہ کے ذریعہ ممکن ہوا ہے جس کو ادارہ (institution) کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید میں اداروں نے متوازی ایمپائر کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مثال کے طور پر انڈیا میں مسیحی فرقہ نے ایک چھوٹی اقلیت ہونے کے باوجود ملک میں اپنا ایجوکیشنل ایمپائر بنا لیا ہے۔ اسی طرح پارسی فرقہ نے ملک میں اپنا انڈسٹریل ایمپائر بنا لیا ہے۔ اسی طرح امریکا میں یہودی اقلیت نے اپنا اقتصادی ایمپائر بنا لیا ہے، وغیرہ۔

مسلمانوں کے لیے ہر ملک میں یہ ممکن تھا کہ وہ دانش مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنے اعلیٰ ادارے بنائیں اور سیاسی اقتدار کے بغیر اپنا ایک متوازی ایمپائر قائم کر سکیں۔ خاص طور پر دعوہ ایمپائر کا میدان تو وہ میدان ہے جہاں مسلمانوں کو اجارہ داری کی حد تک اعلیٰ مواقع حاصل ہیں۔ مگر زمانہ سے بے خبری کی بنا پر مسلمان اب تک اس امکان کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے۔

گر کر اٹھنا

فیض آباد کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ایک عربی مدرسہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد میں ایک مدرسہ میں استاد ہو گیا۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ میں اپنی آمدنی بڑھاؤں۔ میں نے کچھ لوگوں سے پیسہ لیا اور مضاربت کے اصول پر کاروبار شروع کیا۔ مگر کئی سال کی کوشش کے باوجود میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب میرے اوپر لوگوں کا قرض لدا ہوا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میں سخت احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ مجھے کچھ مشورہ دیں تا کہ میں اس دلدل سے نکل سکوں۔

میں نے کہا کہ آپ سب سے پہلے یہ کیجئے کہ آپ اپنے ذہن کو بدلئے۔ آپ یہ نہ کہیے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوں، بلکہ یہ کہیے کہ میں احساس غلطی میں مبتلا ہوں۔ کمتری کا احساس آدمی کو پست ہمت بناتا ہے۔ اس کے برعکس غلطی کا احساس آدمی کے اندر نیا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کو جان کر دوبارہ زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ آخر کار وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بمبئی کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی کچھ ناکامیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ اب میں اپنے کو ایک ہارا ہوا انسان سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں ہار گیا بلکہ آپ یہ سوچئے کہ میں نے غلطی کی۔ آپ جب اس طرح سوچیں گے تو آپ کے اندر نیا حوصلہ ابھرے گا۔ اب آپ یہ سوچیں گے کہ پہلا چانس تو میری غلطی سے کھویا گیا۔ اب مجھ کو چاہیے کہ زیادہ ہوش مندی کے ساتھ کام کروں اور دوسرے چانس کو نہ کھوؤں۔

کامیابی اور ناکامی دونوں کا تعلق سوچ سے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اگر عملی زندگی میں اس کو کوئی ہار ہو جائے تو وہ سوچ کی سطح پر کبھی نہ ہارے۔ ایسے آدمی کو کوئی بھی چیز کامیابی سے روکنے والی نہیں۔ غلطی کا اعتراف ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ نئے حوصلے کے ساتھ جیتنے کا دوسرا نام ہے۔

نہ لڑنا بھی ایک اصول ہے

ہاتھی کے چھوٹے بچہ کا راستہ روکنے کے لیے آپ اس کے آگے کھڑے ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ بچہ جب بڑھتے بڑھتے پورا ہاتھی بن جائے تو آپ کو خود اس کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے — یہ فطرت کا ایک اصول ہے۔ اس اصول کی تصدیق خود قرآن میں موجود ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں سلطنت سبا کی تاریخ کا ایک حوالہ دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی میں بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں۔ مگر جب ان کا مقابلہ سلیمان بن داؤد سے پیش آیا جن کو خدا نے ھب لی ملکا لاینبغی لأحد من بعدی (ص ۳۵) کی نسبت دی تھی تو ان کے سربراہِ سلطنت نے جنگی مقابلہ کرنے کے بجائے پرامن مصالحت کا طریقہ اختیار کیا (النمل ۳۴)

یہ زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور قوم سے بھی۔ جو لوگ اس اصول کا لحاظ نہ کریں وہ یقیناً اپنے کو تباہ کرلیں گے، خواہ انہوں نے اپنا یہ عمل جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے نام پر کیوں نہ کیا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ تمام طاقتوں کا مالک خدا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ دنیا میں خدا نے انسان کو آزادی دی ہے۔ اس آزادی کا تعلق خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) سے ہے۔ اسی نقشہ کی بنیاد پر ہر انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس لیے آزادی کا یہ نظام ہرگز ختم ہونے والا نہیں۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے اور خدا موجودہ نقشہ کو بدل کر ایک اور نقشہ کے مطابق دنیا کا نظام قائم کرے۔

زندگی میں اقدام سے زیادہ صبر کی اہمیت ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ بے فائدہ ٹکراؤ سے بچ کر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانا اور مثبت تعمیر کے میدان میں آگے بڑھتے رہنا۔ صبر زندگی کے ہر مرحلہ میں ضروری ہے۔ معاملات میں صبر کی اہمیت اگر ۹۹ فی صد ہے تو اقدام کی حیثیت صرف ایک فی صد۔

دو قسم کے انسان

کامیاب انسان کون ہے اور ناکام انسان کون۔ ایک جملہ میں دونوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ — کامیاب انسان وہ ہے، جس کو ناکامی کا اندیشہ لگا ہوا ہو اور ناکام انسان وہ ہے جو کامیابی کے یقین کے ساتھ اپنے عمل کا آغاز کرے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ آدمی اپنے کام کے معاملہ میں سنجیدہ ہے یا نہیں۔ جو آدمی سنجیدہ اور حقیقت پسند ہو وہ اپنے غور وفکر کے ذریعہ اس بات کو جان لے گا کہ دنیا میں خواہ کوئی بھی کام کیا جائے ہر معاملہ میں اس کی اپنی کوشش پچاس فیصد ہوتی ہے اور بقیہ پچاس فیصد عوامل وہ ہیں جو اس کی ذات سے باہر ہیں۔ ان دونوں قسم کے عوامل کی موافق یکجائی سے وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو کامیابی کہتے ہیں۔

کامیابی کے احساس میں جینے سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے بارہ میں زیادہ اندازہ (over-estimation) کی نفسیات میں مبتلا ہو۔ ایسا آدمی غیر حقیقت پسند بن جائے گا۔ وہ اپنی طاقت سے زیادہ بڑا اقدام کر ڈالے گا۔ وہ کامیابی کے فرضی یقین کے تحت ناکامی کی طرف چھلانگ لگادے گا۔ نہ ملنے والی چیز کے شوق میں وہ ملنے والی چیز کو بھی کھو دے گا۔

اس کے برعکس معاملہ اس انسان کا ہے جو ناکامی کے اندیشہ میں جیتا ہو۔ ایسا آدمی اپنی داخلی نفسیات کی بنا پر ہمیشہ چوکس رہے گا۔ وہ جذباتی فیصلہ کے تحت کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ اُس کا سفر ہاتھی کی مانند ہوگا۔ ہاتھی جب کسی نالہ یا ندی کو پار کرتا ہے تو وہ ہر قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے۔ کیوں کہ اُس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا پاؤں کسی نرم زمین میں دھنس گیا تو اپنے بھاری بھرکم جسم کی بنا پر وہ اس میں پھنس کر رہ جائے گا۔

دانش مند آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے پلس پوائنٹ کے ساتھ اپنے مائنس پوائنٹ کو بھی جانے۔ وہ اپنی کمیوں پر نظر رکھتا ہوا آگے بڑھے۔ ایسا آدمی زندگی کے سفر میں کبھی ناکام نہ ہوگا۔

زندگی کی جدوجہد

زندگی ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد انسان کے پیدا ہوتے ہی شروع ہوتی ہے اور اُس کی عمر کے آخر وقت تک باقی رہتی ہے۔ زندگی کبھی جدوجہد سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی کی زندگی جدوجہد سے خالی ہو تو وہ زندگی ہی نہ ہوگی۔ جدوجہد کے بغیر زندگی ایک قسم کی موت ہے، وہ کوئی مطلوب زندگی نہیں۔

جدوجہد انسان کو تازہ دَم رکھتی ہے۔ جدوجہد کے ذریعہ ذہن ارتقاء کرتا ہے۔ جدوجہد کے ذریعہ انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جدوجہد انسان کو پختگی عطا کرتی ہے۔ جدوجہد کے دوران آدمی کو ہر قسم کے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ جدوجہد ایک ناقص انسان کو کامل انسان بناتی ہے۔

جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ جدوجہد کرنے والا تو وہ خود ہے۔ مگر جس دنیا میں اس کو جدوجہد کرنا ہے وہ دنیا خود اُس نے نہیں بنائی۔ بلکہ اُس کو بنانے والا کوئی اور ہے۔ اس دنیا کا اپنا ایک قانون ہے۔ یہ قانون کبھی بدلنے والا نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی جدوجہد کو دنیا کے نقشہ سے مطابقت کرتے ہوئے چلائے۔ وہ دنیا کے فطری نظام کے ساتھ ٹکراؤ نہ کرے بلکہ اُس کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہوئے اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔

جدوجہد کیا ہے۔ جدوجہد دراصل مواقعِ فطرت کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس دنیا میں بے شمار مواقع ہیں۔ یہ مواقع ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو ان مواقع کو دریافت کرے اور فطرت کے قانون کی رعایت کرتے ہوئے ان کو استعمال کرے۔ اسی دریافت اور اسی استعمال کے نتیجہ کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

کامیابی کوئی اتفاقی چیز نہیں۔ کامیابی دراصل درست عمل کے درست انجام کا دوسرا نام ہے۔ جدوجہد اور کامیابی کے درمیان وہی نسبت ہے جو درخت کے بیج اور درخت کے پھل کے درمیان ہوتی ہے۔ جہاں بیج ہوگا وہاں درخت ہوگا اور جہاں درخت ہوگا وہاں پھل بھی ضرور مل کر رہے گا۔

اعتراف نئے دور کا آغاز

ہر آدمی غلطی کرتا ہے اور سب سے بہتر غلطی کرنے والا وہ ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں نے غلطی کی۔
غلطی کا اعتراف غلطی کرنے والے کے لیے نئے درجات کا آغاز ہے۔ جب کہ اس کے برعکس جو آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے وہ اسی غلطی میں بدستور پڑا رہے گا۔ وہ کبھی اس سے نکل نہ سکے گا۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنا بزدلی ہے اور غلطی کا اعتراف کرنا بہادری۔ غلطی کرنا ایک نقصان کی بات ہے۔ لیکن جب آدمی اپنی غلطی کا اعتراف کر لے تو گویا اُس نے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔

غلطی کا اعتراف تمام انسانی خوبیوں میں سب سے بڑی انسانی خوبی ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لے، اُس کے اندر اس اعتراف کے نتیجہ میں ہر قسم کی مثبت خوبیاں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔ اُس کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے، اور تواضع علم کی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ اس کے اندر اصلاحِ خویش کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو اس کی شخصیت کو مسلسل ارتقاء یافتہ شخصیت بناتا رہتا ہے۔ اُس کے اندر حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو کامل حق تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اُس کے اندر مثبت طرزِ فکر پیدا ہوتا ہے اور مثبت طرزِ فکر تمام انسانی ترقیوں کا زینہ ہے۔ اس کے اندر متکبرانہ نفسیات کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور جو شخص متکبرانہ نفسیات سے پاک ہو وہی وہ شخص ہے جس نے سچی انسانیت کا تجربہ کیا۔

غلطی کا اعتراف ذہن کے بند دروازوں کو کھولتا ہے۔ غلطی کا اعتراف آدمی کو قلب کی تنگی سے بچاتا ہے۔ غلطی کا اعتراف بظاہر ایک سادہ بات ہے۔ مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ اس سے بڑی خوبی اور کوئی نہیں۔ جو آدمی اعلیٰ انسانی درجہ تک پہنچنا چاہتا ہو اُس کو ہمیشہ غلطی کے اعتراف کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

غلطی کا اعتراف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹھوکر کھانے کے بعد دوبارہ اُٹھ کھڑا ہونا۔ ایسے آدمی کا راستہ کبھی رُکنے والا نہیں۔ وہ ضرور منزل پر پہنچ کر رہے گا۔

زحمت بھی رحمت ہے

زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ایک مشہور مقولہ ہے۔ یہ مقولہ فطرت کے ایک اُصول کو بتاتا ہے۔ وہ اصول یہ کہ جب کسی انسان کو زحمت پیش آتی ہے تو اس کی ذہنی صلاحیتیں متحرک ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر کام کرنے کی پوزیشن میں ہوجاتا ہے۔ اسی بات کو کسی نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ — آسانی نہیں بلکہ کوشش، سہولت نہیں بلکہ دشواری وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے:

It is not ease but effort, not facility but difficulty that makes men.

انسان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ یہ صلاحیتیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ انسان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے کے لیے اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کو شاک ٹریٹمنٹ کہا جاتا ہے۔ زندگی کی مشکلات یہی شاک ٹریٹمنٹ کا کام کرتی ہیں۔ وہ بند ذہن کو کھولتی ہیں۔ وہ جامد انسان کو حرکت میں لاتی ہیں۔ وہ ایک معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتی ہیں۔ جب آدمی کو کوئی مشکل پیش آئے تو اس کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ فطرت نے اس کی زندگی میں وہ عمل (process) جاری کیا ہے جو اس کے اپنے فائدے کے لیے ضروری ہو۔ جو اس کو ترقی کی منزل کی طرف لے جانے والا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مشکل کو مشکل نہ سمجھے بلکہ وہ اس کو چیلنج سمجھے۔ مشکل کا لفظ بے ہمتی پیدا کرتا ہے۔ مگر جب مشکل کو چیلنج کے روپ میں لیا جائے تو وہی چیز اس کا حوصلہ بڑھانے والی بن جائے گی۔

جب کوئی مشکل پیش آئے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ معتدل ذہن کے تحت سوچے۔ وہ دل شکستہ ہونے کے بجائے صورتِ حال کا جائزہ لے۔ وہ اپنے عمل کی ازسرِ نو منصوبہ بندی کرے۔ وہ حالات کے اندر نئے امکانات کو تلاش کرے۔ وہ پورے معاملہ کا دوبارہ اندازہ (re-assessment) کرے۔ جب کوئی آدمی ایسا کرے تو اس کے بعد وہ پائے گا کہ دشواری ایک قابلِ حل مسئلہ تھی، وہ ایسا مسئلہ نہیں تھی جس کا کوئی حل ہی موجود نہ ہو۔ نادان انسان کے لیے مشکل ایک رکاوٹ ہے۔ مگر دانش مند انسان کے لیے مشکل ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

حقیقت پسندانہ مزاج

زندگی میں کامیابی کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز حقیقت پسندانہ مزاج ہے۔ محض اپنی ذاتی امنگوں کے تحت میدان میں کود پڑنا جذباتیت ہے، اور جذباتیت کسی کے لیے ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس کے برعکس خارجی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقدام کرنا حقیقت پسندی ہے، اور حقیقت پسندی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہ اصول فرد کے لیے بھی صحیح ہے اور جماعت کے لیے بھی۔

ان دونوں قسم کے اقدامات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ پہلا اقدام جذباتی اقدام ہے، اور دوسرا اقدام منصوبہ بند اقدام۔ منصوبہ بند اقدام کے لیے سب سے زیادہ اہمیت صبر وتحمل کی ہے۔ آدمی کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے اندر وہی جذبہ بھڑک اُٹھتا ہے جو اُس کو اقدام کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ مثلاً حسد، حرص، غصہ، انتقام، وغیرہ۔ اس قسم کے احساسات آدمی کو جذباتی اقدام پر اُبھارتے ہیں۔ یہ ایک جذباتی طوفان کا لمحہ ہوتا ہے۔ اُس وقت جو چیز آدمی کو غلط اقدام سے بچاتی ہے وہ صبر وتحمل کی صفت ہے۔

صبر وتحمل کا یہ فائدہ ہے کہ وہ آدمی کو ہیجانی کیفیت سے بچائے۔ وہ انسان کے اندر اعتدال پیدا کرکے اس کو اس قابل بنائے کہ وہ غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ سکے۔ وہ غیر جانب دارانہ جائزہ کے تحت اپنا فیصلہ لے سکے۔ وہ آدمی کے اقدام کو نتیجہ خیز اقدام بنائے۔

جذباتیت یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیزی پر مشتعل ہوجائے۔ کوئی غصہ دلائے تو وہ اُس سے انتقام لینے کے درپے ہوجائے۔ کوئی شوق اس کے اندر اُبھرے تو سوچے سمجھے بغیر وہ اس کی طرف چھلانگ لگادے۔ اس کے برعکس حقیقت پسندی یہ ہے کہ آدمی اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ کوئی خواہش اُس کے اندر اُبھرے تو وہ ایسا نہ کرے کہ وہ حالات کو نظر انداز کرکے اپنی خواہش کو پورا کرنے کی طرف دوڑ پڑے۔ جذباتیت کا نتیجہ عجلت پسندی ہے۔ اس کے مقابلہ میں حقیقت پسندی سے یہ مزاج بنتا ہے کہ آدمی جو کام کرے وہ اس کو بھرپور جائزہ لینے کے بعد کرے۔

کامیاب زندگی

ہر آدمی کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو حقیقی معنوں میں کامیابی حاصل ہو۔ اس فرق کا سبب یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ خوش قسمت ہیں اور کچھ لوگ بد قسمت۔ پیدا کرنے والے نے کسی بھی مرد یا عورت کو بد قسمت پیدا نہیں کیا۔ خدا کے کارخانہ سے ہر آدمی خوش قسمت ہی بنا کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو الطاف حسین حالی نے ایک آیت کے حوالہ سے اس طرح بیان کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حالت کو بدلنے کا خیال کرنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ غیر جانب دارانہ طور پر اپنی حالت کا اندازہ کریں۔ اس کے بعد ممکن مواقع کو دریافت کریں اور یہ جانیں کہ ان مواقع کو استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہی کامیابی کا آغاز ہے۔ کامیابی پہلے درجۂ شعور میں حاصل کی جاتی ہے، اس کے بعد وہ درجۂ عمل تک پہنچتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بے شعوری بھی اُتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ بے عملی۔ جو آدمی شعور کی صلاحیت سے خالی ہو وہ گویا اس قابل ہی نہیں کہ معاملات میں درست رائے قائم کر سکے۔ اپنی بے شعوری کی بنا پر وہ معاملات میں غلط رائے قائم کرے گا اور غلط قسم کے اقدامات کرے گا۔ اور حقائق کی اس دنیا میں غلط اقدام کبھی درست نتیجہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اس دنیا میں باشعور آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور بے شعور آدمی ہمیشہ ناکام۔

اس دنیا کو خدا نے اپنے مقرر نقشہ کے مطابق بنایا ہے۔ اس دنیا میں خدا کا ابدی قانون نافذ ہے۔ اس قانون کے مطابق ہی کسی کو یہاں کامیابی یا ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس قانونِ فطرت کو سمجھے اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہی حقیقت پسند لوگ ہیں، اور جو لوگ حقیقت پسند ہوں اُن کے لیے اس دنیا میں کامیابی اُتنی ہی یقینی ہے جتنا کہ رات کے بعد دن کا آنا یا شام کی تاریکی کے بعد دوبارہ اگلی صبح کو روشنی کا ظاہر ہونا۔

سادگی کی اہمیت

سادگی کی اہمیت کسی انسان کے لیے اتنی زیادہ ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں۔ سادگی اعلیٰ کامیابی کا زینہ ہے۔ جو شخص سادگی کو اختیار نہ کر سکے وہ یقینی طور پر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

سادگی محض ایک اخلاقی صفت نہیں۔ سادگی ایک مکمل طرز حیات ہے۔ سادگی آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کا کوئی حصہ بے فائدہ طور پر ضائع کرے۔ سادہ آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنے وقت کو زیادہ مفید طور پر استعمال کرے۔ سادگی دوسرے لفظوں میں، وقت اور مال کو زیادہ بہتر طور پر مینج (manage) کرنے کا فن ہے۔

سادگی کا تعلق ہر چیز سے ہے۔ لباس، کھانا، فرنیچر، سواری، مکان، تقریبات، وغیرہ۔ زندگی کی ہر سرگرمی میں آدمی کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب رہتا ہے۔ یا تو وہ تعیش اور نام ونمود کے پہلو کو سامنے رکھے اور اپنا مال ان میں خرچ کرتا رہے۔ یا وہ صرف اپنی ناگزیر ضروریات کو دیکھے اور اپنے مال کو صرف حقیقی ضرورت کی مدوں میں خرچ کرے۔

غیر ضروری مدوں میں اپنا مال خرچ کرنے کا نقصان صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں آپ کا مال غیر ضروری طور پر ضائع ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کریں وہ مادی نمائش کی چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ان کا فکر سطحی چیزوں سے اوپر نہیں اٹھ پاتا۔ اس کا نقصان اسے اس شدید صورت میں بھگتنا پڑتا ہے کہ اس کا ذہنی ارتقاء (intellectual development) رک جاتا ہے۔ ایسا انسان بظاہر زرق برق چیزوں کے درمیان دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے ذہن کے اعتبار سے وہ حیوان کی سطح پر جینے لگتا ہے۔ وہ اعلیٰ ذہنی ترقی سے محروم رہ جاتا ہے۔

سادگی روحانیت کا لباس ہے۔ سادگی روحانی انسان کا کلچر ہے۔ سادگی ربانی انسان کی غذا ہے۔ سادگی فطرت کا اصول ہے، سادگی سنجیدہ انسان کی روش ہے، سادگی ذمہ دارانہ زندگی کی علامت ہے، سادگی با مقصد انسان کا طرزِ حیات ہے۔

محنت، پلاننگ

قدیم زمانہ سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب سے بڑی چیز محنت ہے۔ قدیم عربی مقولہ ہے کہ: من جد وجد (جس نے کوشش کی اُس نے پایا)۔ ہر زبان میں اس طرح کے مقولے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ محنت کامیابی کا زینہ ہے۔

یہ بات درست ہے اور آج بھی محنت کی اُسی طرح اہمیت ہے جس طرح اُس کی اہمیت پہلے تھی۔ مگر نئی تبدیلیوں کے بعد یہ فارمولا اب دو نکاتی فارمولا میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اب محنت کے ساتھ منصوبہ بندی (planning) بھی لازمی طور پر ضروری ہوگئی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جدید اُصول کے مطابق، منصوبہ بندی کا درجہ پہلے ہے اور محنت کا درجہ اس کے بعد۔

منصوبہ بندی یہ ہے کہ عملی طور پر کام شروع کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ مواقع اور امکانات کو دریافت کیا جائے۔ تمام متعلق پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ وہ کام کیا جائے جس کو آج کل کی زبان میں نیٹ ورکنگ کہا جاتا ہے۔

محنت کی حیثیت اگر جسمانی عمل کی ہے تو منصوبہ بندی کی حیثیت دماغی عمل کی۔ پہلے زمانہ میں بھی کامیابی کے لیے دماغی عمل کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں دماغی عمل کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کارخانہ کھولنے سے لے کر جنگ لڑنے تک اور اسکول چلانے سے لے کر حکومتی نظام قائم کرنے تک ہر جگہ دماغی عمل نے اولین اہمیت حاصل کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی قومیں جو قدیم دور میں آگے تھیں اب وہ پیچھے چلی گئی ہیں۔ کیوں کہ اُنہوں نے اپنے کام کو منصوبہ بندی کے دور میں نہیں پہنچایا۔ قدیم زمانہ میں کسی کام کو چلانے کے لیے محنت کافی ہوتی تھی۔ مگر جدید منصوبہ بندی نے علم کو بہت زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ کامیاب منصوبہ بندی وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اپنے اندر علم کی صلاحیت پیدا کرلی ہو۔ علم کی صلاحیت کے بغیر کوئی شخص یا گروہ اپنے کام کو منصوبہ بند انداز میں منظم نہیں کرسکتا۔

نہ کرنا بھی کام ہے

عام طور پر لوگ صرف کرنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بعض اوقات یہ بھی کام ہوتا ہے کہ کچھ نہ کیا جائے۔ بولنے کے بجائے خاموشی اختیار کی جائے، اقدام کے بجائے عمل سے پرہیز کیا جائے، وار کا جواب دینے کے بجائے وار کو خالی جانے دیا جائے۔

جنگل کے جانور فطرت کی تعلیم کے تحت ایسا ہی کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی طوفان دیکھتے ہیں تو وہ زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ طوفان کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ ان سے ٹکرائے بغیر آگے بڑھ جائے۔

اصل یہ ہے کہ کام برائے کام کوئی چیز نہیں۔ کام وہ ہے جو نتیجہ رخی (result-oriented) کام ہو۔ وہی کام حقیقی کام ہے جو مثبت نتیجہ برآمد کرے۔ جو کام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بے فائدہ ہو یا جس کام کا الٹا نتیجہ نکلے وہ کام نہیں۔ بے نتیجہ کام کرنا کام کرنا نہیں ہے بلکہ وہ کام کو بگاڑنا ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ بولنے سے پہلے سوچا جائے۔ عمل کرنے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ اقدام کرنے سے پہلے اس کی منصوبہ بندی کی جائے۔ دانشمند آدمی کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ شخص نادان ہے جو سوچے بغیر عمل کے میدان میں کود پڑے اور جب اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو وہ دوسروں پر اس کا الزام دینے لگے۔ بغیر سوچے ہوئے کوئی کام کرنا ایسا ہی ہے جیسے کشتی کے بغیر سمندر میں داخل ہو جانا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجرد حرکت کوئی کام نہیں، حرکت کو بامقصد ہونا چاہئے۔ یہی انسان کی انسانیت کے مطابق ہے۔ جب ایک آدمی کسی مفید کام کو انجام دے تو اس نے اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو ثابت کیا اور جب ایک شخص ایک ایسا کام کرے جس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے تو اس نے گویا اپنے انسان ہونے کی حیثیت ہی کو مشتبہ بنا دیا۔ حقیقی انسان وہ ہے جو نتیجہ خیز کام کرے، بے نتیجہ کام کرنے والا سرے سے انسان ہی نہیں۔

تعلیمی پیغام

جموں کشمیر میں ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جس کا نام مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ ہے۔ اس ادارہ کے تحت مسٹر خورشید بسمل اور ان کے ساتھیوں نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۶ کو تھنہ منڈی میں ایک اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول ترقی کرکے اب ایک بڑا ادارہ بن گیا ہے۔ یکم نومبر ۲۰۰۴ کو اس ادارہ کا ۲۹ واں فاؤنڈیشن ڈے منایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو مزید ترقی دے۔ وہ نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

تعلیم بلاشبہہ تمام ضروری چیزوں میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ تعلیم نہ صرف دنیوی زندگی کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے بلکہ فارسی شاعر کے الفاظ میں، خدا کی معرفت بھی علم کے بغیر نہیں ملتی: کہ بے علم نتواں خدارا شناخت۔

علم کے ذریعہ آدمی زندگی کا سلیقہ سیکھتا ہے۔ علم کے ذریعہ اس کو ماضی اور حال کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ علم کے ذریعہ وہ مواقع اور امکانات کو جانتا ہے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی نتیجہ خیز منصوبہ بندی کرے۔ علم کے ذریعہ آدمی صحیح اور غلط کی پہچان حاصل کرتا ہے۔ علم کے ذریعہ آدمی جانتا ہے کہ جذباتیت اور حقیقت پسندی میں کیا فرق ہے۔

علم کے ذریعہ آدمی کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو آرٹ آف ڈیفرنس مینجمنٹ (art of difference management) کہا جاتا ہے۔ علم آدمی کو وہ شعور دیتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے سماج کا صحت مند ممبر بنے۔ علم سے آدمی کو وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ تخریبی اقدام اور تعمیری اقدام کے فرق کو جانے۔ علم آدمی کو یہ صلاحیت عطا کرتا ہے کہ وہ ممکن اور ناممکن میں تمیز کرسکے، وہ ناممکن کو چھوڑ کر ممکن میں اپنی طاقت کو لگائے۔

علم انسان کو مکمل انسان بناتا ہے۔ علم سے آدمی اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور خدا کو بھی۔ علم کے ذریعہ دین میں بھی ترقی حاصل ہوتی ہے اور دنیا میں بھی۔ علم انسان کو حیوانیت سے اُٹھا کر حقیقی انسان کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔

بامقصد زندگی

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ انسان جو سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا ایک واضح مقصد متعین کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے سامنے کوئی واضح مقصد نہ ہو۔ وہ حالات یا خواہشات کے تحت کبھی ایک کام کرے، اور کبھی دوسرا کام کرنے میں لگ جائے۔ پہلی قسم کے لوگ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ ہمیشہ ناکام۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ فرق کوئی سادہ فرق نہیں۔ ان سے دو الگ الگ قسم کی زندگیاں بنتی ہیں۔ جو آدمی اس طرح زندگی گذارے کہ اُس کے سامنے ایک واضح نشانہ ہو، اس کا حال یہ ہوگا کہ وہی نشانہ اُس کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے گا۔ وہ اُسی کے لیے سوچے گا۔ اُس کے تمام جذبات اُسی کے ساتھ جڑ جائیں گے۔ وہ اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اسی ایک کام میں صرف کرے گا۔ وہ اپنی ساری پونجی اسی راہ میں لگا دے گا۔ اسی مقصد کے تحت وہ کسی سے کٹے گا اور کسی کے ساتھ جڑ جائے گا۔ اسی کے مطابق، وہ کسی کو اپنا دوست بنائے گا اور کسی کو اپنا دشمن سمجھ لے گا۔ وہ اسی کے ساتھ اپنی شام کرے گا اور اسی کے ساتھ اس کی صبح طلوع ہوگی۔

اس قسم کی زندگی کا انجام پیشگی طور پر معلوم ہے، اور وہ انجام یہ ہے کہ ایسا شخص یقینی طور پر کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ اپنی نادانی کے سوا کوئی بھی دوسری چیز اس کو ناکام کرنے والی نہیں۔

اس کے برعکس معاملہ اس انسان کا ہے جس کے سامنے زندگی کا کوئی واضح مقصد نہ ہو۔ ایسا انسان سمت کے شعور (sense of direction) سے محروم رہے گا۔ اس کی سوچ اور اس کا عمل دونوں مختلف راہوں میں بکھرے رہیں گے۔ وہ اپنی پونجی کو بے فائدہ طور پر اِدھر اُدھر ضائع کرتا رہے گا۔ وہ اپنی طاقت کو مختلف میدانوں میں بکھیر کر خود ہی اپنے آپ کو کمزور بنا لے گا۔ ایسے آدمی کا انجام یقینی طور پر تباہی ہے۔ وہ ناکامی کی زندگی گذارے گا اور آخر کار ناکام حالت میں مرجائے گا۔ بامقصد زندگی کا نام کامیاب زندگی ہے، اور بے مقصد زندگی کا نام ناکام زندگی۔

مستقبل کا انتظار

کوئی شخص اگر مجھ سے پوچھے کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے سب سے زیادہ یقینی فارمولا ایک لفظ میں کیا ہے تو میں کہوں گا کہ یہ سنگل پوائنٹ فارمولا صبر ہے۔ صبر کو اس معاملہ میں مشکل کُشا کی حیثیت حاصل ہے۔ تدبیر کار سمجھ میں آئے یا نہ سمجھ میں آئے، دونوں حالتوں میں صبر کر لینا ہی آخر کار کامیاب ہونے کے لیے کافی ہے۔

صبر کیا ہے۔ صبر نہ تو بے ہمتی ہے اور نہ بے عملی۔ صبر اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک گہری عملی تدبیر ہے۔ صبر اُسی طرح ایک تدبیری عمل ہے جس طرح دوسرا کوئی عمل تدبیری عمل ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ بے صبر آدمی نتیجہ کو حال میں پانا چاہتا ہے۔ اور صبر والا آدمی نتیجہ کے معاملہ کو مستقبل کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ ایک اُردو شاعر نے کہا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ بظاہر ایک شاعرانہ بات ہے۔ مگر وہ شاعرانہ اُسلوب میں ایک فطری حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام تعمیر کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ یہاں ہر تخریب کے بعد اپنے آپ ایسے اسباب فراہم ہونے لگتے ہیں جو اس کی نئی تعمیر کر سکیں۔ ایسی حالت میں صبر کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کی تعمیری طاقتوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے کام کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔

ہمارے جسم میں اگر کوئی زخم آ جائے یا جسمانی نظام میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو جسم کا داخلی نظام اپنے آپ اس کی مرمت اور درستگی میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جسم دوبارہ اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے۔ یہی معاملہ جسم سے باہر کی زندگی کا ہے۔ انسانی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو فطرت کا نظام اپنے آپ اس کی اصلاح کے لیے متحرک ہو جاتا ہے۔ اگر انسان صبر کرے اور انتظار کی روش اختیار کرے تو جلد ہی وہ دیکھے گا کہ اس کی براہِ راست کوشش کے بغیر سارا مسئلہ اُسی طرح حل ہو گیا ہے جیسا کہ وہ خود چاہتا تھا۔

رزق خدا کے ہاتھ میں

دہلی کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ انہوں نے ایم بی اے کا کورس کیا ہے۔ وہ ایک غیر ملکی کمپنی میں سروس کرتے ہیں۔ عام غیر ملکی کمپنیوں کی طرح اس کمپنی کا اُصول یہ ہے کہ ملازمت دو اور برخاست کردو (hire and fire) اُنہوں نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ بظاہر میں ایک اچھی ملازمت میں ہوں۔ مگر مجھے ہر وقت ٹنشن رہتا ہے۔ ہر وقت مجھے سروس کھونے کا اندیشہ (fear of losing job) پریشانی میں مبتلا کیے رہتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی پریشانی ایک نفسیاتی پریشانی ہے، نہ کہ کوئی حقیقی پریشانی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ رزق کی تقسیم خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ خدا جس کو چاہے دے اور خدا جس کو چاہے محروم کردے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک سادہ فارمولا دیتا ہوں۔ اس کو آپ اپنے ذہن میں بٹھا لیجیے اور پھر آپ کو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ وہ فارمولا یہ ہے — ایک شخص آپ کی سروس کو چھین سکتا ہے مگر کوئی شخص اتنا طاقتور نہیں کہ وہ آپ سے آپ کی قسمت کو چھین لے:

One can take away your job, but no one has
the power to take away your destiny.

کہیں میری سروس نہ چلی جائے — اس خیال میں فکرمند ہونے کے بجائے آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ لائق بنائے کہ کوئی شخص اُس کی سروس ختم کرنے کی ہمت ہی نہ کرسکے۔ اس مسئلہ کا حل اندیشہ میں مبتلا ہونا نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو زیادہ کارآمد بنانا ہے، اپنے آپ کو دوسروں کے لیے مفید تر بنانا ہے۔ کوئی بھی شخص ایک کارآمد انسان کو کھونے کا تحمل نہیں کرسکتا۔ یہ صرف ناکارہ لوگ ہیں جو محروم کیے جاتے ہیں، اور پھر اپنی محرومی پر شکایت کا دفتر کھول دیتے ہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی فطری صلاحیت پر بھروسہ کرے نہ کہ دوسروں کے رویہ پر۔ ہر آدمی کی قسمت اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ مگر غلطی سے وہ اس کو دوسرے کے ہاتھ میں سمجھ لیتا ہے۔

ایک کے بدلہ میں دَس

مارک ٹوین (Mark Twain) امریکا کا مشہور ناول نگار ہے۔ وہ ۱۸۳۵ میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول یہ ہے — دینے اور لینے کا اصول دراصل ایک تدبیر کار ہے۔ یعنی ایک دو اور دس پاؤ:

The principle of give and take is the principle of diplomacy— give one and take ten.

دینے والا جب کسی معاملہ کو دے کر ختم کرتا ہے تو بظاہر وہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ کھو دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شرافت کا ایک معاملہ ہوتا ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس دنیا میں اُسی کو کامیابی ملتی ہے جو شریفانہ اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ وہ جتنا دیتا ہے اُس سے بہت زیادہ وہ آخر کار پالیتا ہے۔ وہ اگر ایک کے بقدر دیتا ہے تو واپس ہو کر وہ اُس کو دس کے بقدر ملتا ہے۔

ایک دینا وہ ہے جو تجارتی لین دین کے تحت ہو۔ اس لین دین میں دونوں طرف انٹرسٹ ہوتا ہے۔ جو دیتا ہے وہ بھی انٹرسٹ کے لیے دیتا ہے اور جو لیتا ہے وہ بھی انٹرسٹ کے لیے لیتا ہے۔ اس طرح کے لین دین میں برابر کا اُصول ہے۔ یعنی جتنا دینا اُتنا پانا۔ دوسرا لین دین وہ ہے جو انسانی ہمدردی کے تحت کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک شخص کسی ذاتی غرض کے بغیر دوسرے کی خدمت کرے، وہ دوسرے کو یک طرفہ طور پر کوئی عطیہ دے۔

جب کوئی شخص بے غرضانہ طور پر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے یا کسی ذاتی مفاد کے بغیر کوئی چیز اس کو دیتا ہے تو ایسا آدمی اپنے عطیہ کے ساتھ ایک اور انتہائی قیمتی چیز شامل کرتا ہے، اور وہ سچی ہمدردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے کی طرف سے اُس کو جوابی صلہ دیا جاتا ہے تو دینے والا اس کو دس گنا بڑھا کر دیتا ہے، بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ۔ خود غرضانہ لین دین میں یہ اُصول ہے کہ جتنا دو اُتنا پاؤ۔ لیکن بے غرضانہ لین دین کا اصول اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ — جتنا دو اُس سے بہت زیادہ پاؤ۔

بچاؤ کی تدبیر

انگریزی زبان کا ایک مثل ہے کہ — جب دو ہاتھی لڑتے ہیں تو گھاس کچلی جاتی ہے:

When two elephants fight, grass gets crashed.

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دو طاقتور انسان یا دو طاقتور قوم کے درمیان لڑائی ہو تو غریب عوام اُس کے دوران غیر ضروری طور پر نقصان اُٹھاتے ہیں۔ دو کمزور شخص کے درمیان لڑائی ہو تو وہی دو آدمی نقصان اٹھائیں گے جو کہ لڑ رہے ہیں۔ مگر جب دو طاقتور لڑیں تو دوسرے بہت سے لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ ایسی حالت میں کمزور شخص کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا صرف ایک جواب ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو اس ٹکراؤ سے دور رکھے۔ وہ دوری اختیار کر کے اپنے آپ کو اس کی زد میں آنے سے بچائے۔ یہی وہ تدبیر ہے جس کو اسماعیل میرٹھی نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ — اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

زندگی کا اُصول یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو صرف ان چیزوں میں اُلجھائے جس سے نپٹنے کی قدرت اس کے اندر موجود ہو۔ جس معاملہ میں وہ اپنے آپ کو عاجز پائے، آدمی پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُس میں اُلجھنے سے بچائے۔ غیر ضروری طور پر کسی معاملہ میں اُلجھنا اور جب اس سے نقصان کا تجربہ ہو تو اس کے بعد شکایت اور احتجاج کرنا صرف بزدل لوگوں کا طریقہ ہے۔ بہادر آدمی وہ ہے جس کی پالیسی یہ ہو کہ وہ جس کو دبانے کی پوزیشن میں ہو اُس کو دبائے۔ لیکن جس کو دبانے کی طاقت اُس کے اندر نہ ہو اُس سے خود دب جائے۔ یہی بہادری ہے اور یہی شریف انسان کا طریقہ بھی۔

یہی جنگل کے شیر کا طریقہ ہے جس کو اس کی فطرت نے اُسے بتایا ہے۔ شیر کو جب بھوک لگتی ہے تو وہ ہرن کا شکار کرتا ہے۔ لیکن شیر کبھی ہاتھی کا شکار کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ شیر جنگل کا سب سے زیادہ طاقتور جانور ہے۔ مگر شیر کبھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے کسی جانور پر حملہ نہیں کرتا۔ شیر ایک صلح پسند جانور ہے، نہ کہ کوئی جنگ پسند جانور۔

آسان تدبیر

میں نے اپنی ڈائری (۱۷ فروری ۲۰۰۴) میں یہ الفاظ لکھے — جب بھی مجھے کسی سے کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو میں اس معاملہ میں خود اپنی غلطی دریافت کرلیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ شکایت اپنے آپ ختم ہوجاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا ناخوشگوار باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اپنی پسند کے خلاف باتوں کے درمیان جینا پڑتا ہے۔ ایسی ایک ناموافق دنیا میں آدمی کس طرح زندگی گذارے۔ وہ ناخوش گوار تجربات کے درمیان کس طرح اپنے لیے ایک خوش گوار زندگی کی تعمیر کرے۔ اس کا فارمولا صرف ایک ہے اور وہ ہے: ناخوش گواری کو خوش گواری میں بدل لینا۔

اس دنیا میں ہر قسم کی ترقی کا سب سے بڑا راز مثبت سوچ ہے۔ تمام ترقیاں اسی مثبت سوچ کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ منفی تجربات کے درمیان مثبت سوچ کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اس کا سب سے آسان فارمولا یہ ہے کہ شکایت پیدا ہوتے ہی آدمی اس کو ڈیفیوز کر کے ختم کردے۔ ڈیفیوز کرنے کے لیے آدمی اگر یہ طریقہ اختیار کرے کہ جس سے شکایت ہوئی ہے اُس سے بحث کر کے اُس کو قائل کرے تو اس طرح کی کوشش میں کامیابی تقریباً صفر کے برابر ہے۔ ایسی حالت میں بہترین تدبیر یہ ہے کہ آدمی خود اپنے اندر شکایت کا سبب دریافت کرے۔ اس طرح وہ ایک لمحہ کے اندر اپنے آپ کو معتدل بنا سکتا ہے، وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنے اندر مثبت سوچ کا عمل دوبارہ جاری کرسکتا ہے۔

اس تدبیر کی معنویت یہ ہے کہ آدمی کو دوسروں کے اوپر تو کوئی اختیار نہیں۔ مگر ہر آدمی خود اپنے آپ پر پورا اختیار رکھتا ہے۔ شکایت کو رفع کرنے کے لیے دوسروں سے آغاز کرنا گویا ناممکن سے آغاز کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں شکایت کو رفع کرنے کے لیے خود اپنے آپ سے آغاز کرنا گویا ممکن سے آغاز کرنا ہے۔ اور جب ممکن سے آغاز کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہو تو کوئی نادان ہی ایسا کرسکتا ہے کہ وہ ناممکن سے آغاز کرنے کی ناکام کوشش کرے۔

لڑے بغیر مقابلہ

صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک قول ہے: **ادفع بحلمك جهل من يجهل عليك** (تم برداشت کے ذریعہ اس شخص کا مقابلہ کرو جو تمہارے ساتھ جہالت کرے)۔ یہ زندگی کا ایک اہم ترین اُصول ہے۔ اس کے مطابق، برداشت بھی ایک طاقت ہے، نہ لڑنا بھی لڑنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔

ہر آدمی کی زندگی میں ایسے مواقع پیش آتے ہیں جب کہ کسی کی بات پر اس کو غصہ آجائے۔ کسی کا قول سُن کر وہ مشتعل ہو جائے۔ کسی کی ایک ناپسندیدہ کارروائی پر اُس کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اُٹھے۔ کسی کے تشدد کے خلاف آدمی کے اندر جوابی تشدد کا رجحان پیدا ہو جائے۔

اس قسم کا موقع ہر آدمی کے لیے بے حد نازک موقع ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر ہر آدمی وقتی جذبہ کے تحت فریق ثانی سے لڑائی شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایسی ہر لڑائی بے نتیجہ انجام پر ختم ہوتی ہے۔ ایسی ہر لڑائی ہمیشہ نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ اگر آدمی ایک لمحہ ٹھہر کر سوچے تو وہ کبھی جوابی کارروائی کی غلطی نہ کرے۔

نادان کی زیادتی کے خلاف جوابی زیادتی کرنا خود اپنے آپ کو بھی نادان ثابت کرنا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص نادانی کر کے آپ کو مشتعل کر دے تو آپ اس مقام سے ہٹ جائیں اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن کو منفی تاثر سے آزاد کر کے نتیجہ کے بارہ میں سوچیں۔ آپ ٹھنڈے ذہن کے ساتھ یہ غور کریں کہ نتیجہ کے اعتبار سے جوابی کارروائی کرنا مفید ہے یا معاملہ کو نظر انداز کر کے چپ ہو جانا زیادہ مفید۔

اگر آپ غیر متاثر ذہن کے تحت سوچیں تو یقیناً آپ اس رائے پر پہنچیں گے کہ اشتعال کے مواقع پر سب سے زیادہ کامیاب پالیسی یہ ہے کہ آپ مشتعل ہونے سے بچیں۔ آپ جوابی اشتعال کے بجائے تحمل کے ساتھ صورت حال کا مقابلہ کریں۔

محنت کا کرشمہ

محمد شفیع الدین نیّر اُردو کے ایک ادیب اور شاعر تھے۔ وہ عرصہ تک ماہنامہ پیام تعلیم (نئی دہلی) کے ایڈیٹر رہے۔ وہ بچوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ اُن کی ایک نظم کا ایک شعر یہ تھا:

محنت سے چل رہے ہیں دنیا کے کارخانے محنت سے مل رہے ہیں ہر قوم کو خزانے

شفیع الدین نیّر صاحب نے اپنے تمام بچوں میں اسی محنت کی روح پھونکی۔ چنانچہ ان کے تمام بچوں نے نہایت محنت اور لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور بڑی بڑی ترقیاں حاصل کیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ محنت تمام ترقیوں کا زینہ ہے۔ محنت کا مطلب کیا ہے۔ محنت کا مطلب ہے، لگاتار جدو جہد۔ جو کام شروع کرنا اُس کو چھوڑے بغیر برابر اپنی کوشش جاری رکھنا۔ اپنی تمام توجہ اور اپنی تمام صلاحیت کو پوری طرح اُس میں لگا دینا۔ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو صرف اسی ایک محاذ پر صرف کر دینا۔ اسی لگاتار جدو جہد کا نام محنت ہے۔

پھر یہ کہ یہ دنیا جس میں انسان اپنے کسی مقصد کے لیے محنت کرتا ہے وہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ اس میں موافق اور غیر موافق دونوں قسم کے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں جو آدمی کے حوصلہ کو توڑ دیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تلخ تجربہ آدمی کے ذہن کو منفی سوچ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اکثر ناموافق حالات میں اپنی محنت کا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔

محنت بلاشبہہ ترقی کا زینہ ہے۔ مگر محنت صرف اُس آدمی کے لیے کارآمد بنتی ہے جو اُسی کے ساتھ یہ حوصلہ رکھتا ہو کہ وہ کسی عذر کو عذر نہیں بنائے گا۔ وہ حالات کی موافقت یا ناموافقت سے بے پروا ہو کر اپنے مقصد کے لیے محنت کرتا رہے گا۔ اس دنیا میں کامیابی کے لیے بلاشبہہ محنت درکار ہے، مگر محنت اُسی شخص کے لیے مفید بنتی ہے جو مسلسل محنت کا حوصلہ رکھتا ہو۔ محنت اپنے آپ کو پوری طرح استعمال کرنے کا نام ہے، اور جو شخص اپنے آپ کو پوری طرح استعمال کرے وہ کبھی ناکام ہونے والا نہیں۔

انسان کا کم تر اندازہ نہ کیجئے

کوئی بھی آدمی آپ کا پیدائشی دشمن نہیں۔ آپ خود اپنے عمل سے کسی کو اپنا دشمن اور کسی کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں — یہ ایک ایسی مسلّم حقیقت ہے جو ہر دور میں اور ہمیشہ صحیح ثابت ہوئی ہے۔ اگر چہ دنیا میں ایسے دانش مند انسانوں کی کمی ہے جو اس حقیقت کو سمجھیں اور اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

انسان کوئی پتھر نہیں۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے اندر احساس رکھتا ہے۔ جو حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ باتوں کو دلائل کی روشنی میں جانچے اور صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرے۔ حق اور ناحق کے درمیان تمیز کرنا، یہ انسان کی ایک ایسی صفت ہے جس میں وہ ساری کائنات میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

انسان کی اس صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بدل سکتا ہے۔ کسی پتھر کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بدل لے۔ مگر انسان کی یہ امتیازی صفت ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی انسان کو مستقل طور پر اپنا دشمن سمجھ لینا انسان کا کم تر اندازہ ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو چاہیے کہ اگر کوئی شخص بظاہر آپ کو اپنا دشمن دکھائی دے تو آپ اس کو اپنا مستقل دشمن نہ سمجھ لیں۔ بلکہ یہ یقین رکھیں کہ آپ اُس کو اپنے حسنِ عمل سے اپنا دوست بنا سکتے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپ کے بارہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہے تو اس کی غلط فہمی کو دور کیجئے۔ کسی کو آپ سے سخت رویہ کی شکایت ہے تو اس کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیجئے۔ کوئی آپ کو بے فائدہ سمجھتا ہے تو اس کو فائدہ پہنچا کر اس کا دل جیتئے۔ کسی کو آپ سے غلط سلوک کا تجربہ ہوا ہے تو اس سے معافی مانگ کر معاملہ کو ختم کر دیجئے۔ کسی کو آپ سے لین دین کی شکایت ہے تو اپنے لین دین کو درست کر کے اُس کی شکایت رفع کیجئے۔ دوسرے کو غلط بتانے کے بجائے خود اپنے اندر غلطی کو تلاش کیجئے۔ اس اُصول پر یقین رکھئے کہ آپ اپنے کو بدل کر ساری دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ اس دنیا میں دوستی ایک ابدی چیز ہے اور دشمنی صرف وقتی۔

صلاحیت کا استعمال

جب بھی میری ملاقات کسی ذہین آدمی سے ہوتی ہے تو اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد اکثر مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ اپنی امکانی صلاحیت کا کمتر استعمال کر رہے ہیں:

You are underusing your potential.

میرا تجربہ ہے کہ اکثر ذہین لوگ اپنی صلاحیت کا وہ استعمال نہیں کر پاتے جو فطرت سے اُنہیں دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جو یونیورسٹی کا اُستاد بننے کے قابل ہے وہ تفریح (entertainment) کی انڈسٹری میں چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی سروس میں اُتنی کمائی نہیں کر سکتا جتنی کمائی وہ تفریح کی انڈسٹری میں کر سکتا ہے۔

میرے نزدیک یہ انسانی صلاحیت کا ایک کمتر استعمال ہے۔ قلم کو اگر آپ زمین کھودنے کے لیے استعمال کریں تو وہ بھی قلم کا ایک استعمال ہوسکتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ قلم کا اعلیٰ استعمال صرف یہ ہے کہ اس کو رائٹنگ کے کام کے لیے استعمال کیا جائے۔

انسان کی امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ ایک مائنڈ رکھتا ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے جس کی صلاحیت کسی اور مخلوق میں نہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کا اعلیٰ استعمال کیا ہے۔ کوئی آدمی اگر اپنے باڈی کو خوبصورت کپڑے پہنا لے تو اُس کو انسانی ترقی نہیں کہا جائے گا۔ کیوں کہ خوبصورت کپڑا تو کسی حیوان کے بدن پر بھی پہنایا جا سکتا ہے۔

انسان کی ترقی یہ ہے کہ اس کے اندر اعلیٰ ذہنی سرگرمیاں (intellectual activities) جاری ہوں۔ وہ تخلیقی فکر کا حامل بن سکے۔ وہ ذہن کی سطح پر اعلیٰ حقیقتوں کو دریافت کرے۔ اسی ذہنی سرگرمی سے انسان کی تمام ترقیاں بندھی ہوئی ہیں۔ زندہ انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو ذہنی ترقی کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچائے، وہ علم کی دنیا میں اپنے لیے اعلیٰ مقام حاصل کر سکے۔ صلاحیت ایک خدائی عطیہ ہے، صلاحیت کا کم تر استعمال عطیہ کی ناقدری کے ہم معنٰی ہے۔

کام کی تلاش

۱۴ دسمبر ۲۰۰۴ کا واقعہ ہے۔ ایک مسلم نوجوان مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ اُنہوں نے اپنا نام محمد عیسیٰ بتایا۔ اُنہوں نے کہا کہ میں ۱۹۹۸ سے بے کار ہوں اور کام کی تلاش میں دلی آیا ہوں۔ اُنہوں نے اپنے کچھ حالات بتائے جس سے اندازہ ہوا کہ انہیں صحیح مشورہ دینے والا کوئی شخص نہیں ملا۔ اُن کے ماں باپ نے بھی غالباً لاڈ پیار کے سوا کوئی ایسی بات نہیں بتائی جو ان کی زندگی کی تعمیر کے لیے مفید ہو۔

میں نے کہا کہ میں آپ کو کوئی کام نہیں دے سکتا۔ البتہ میں آپ کو زندگی کی ایک حقیقت بتا سکتا ہوں جو دنیا میں کام پانے کے لیے ضروری ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ — دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ بے کار ہیں۔ دنیا کو واحد دلچسپی یہ ہے کہ آپ کے اندر کوئی ایسی صلاحیت ہے جو دنیا کے لیے کارآمد ہو۔ آپ کو اگر کام پانا ہے تو اپنے آپ کو کارآمد بنائیے۔ اس کے بعد کام خود آپ کو ڈھونڈھے گا، نہ کہ آپ کام کو ڈھونڈھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بنانے والے نے اس کو انٹرسٹ کی بنیاد پر بنایا ہے۔ ہر آدمی کا اپنا ایک انٹرسٹ ہے، اور اپنے اس انٹرسٹ کے لیے وہ دوڑ رہا ہے۔ ایسی دنیا میں کامیابی کی صورت صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آپ یہ ثابت کرسکیں کہ آپ دنیا کے انٹرسٹ کو پورا کر سکتے ہیں۔ دنیا کے کام آئیے، اور دنیا آپ کو کام دینے پر مجبور ہو جائے گی۔

کام کی تلاش کا ذہن آدمی کے اندر مایوسی پیدا کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کارآمد بنانے کا ذہن آدمی کے اندر یقین اور حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں سے امید نہ رکھے۔ وہ اپنے کام کو خود اپنے اندر تلاش کرے۔ وہ اپنی صلاحیت کو دریافت کرے اور اپنی اس صلاحیت کو ترقی دے کر اپنے آپ کو سماج کے لیے کارآمد بنائے۔ وہ اتنی تیاری کرے کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن جائے۔ دنیا میں کامیابی کا راز یہی ہے۔

غیر فطری محبت

۱۵ اکتوبر ۲۰۰۳ کو میں سورت (گجرات) میں تھا۔ وہاں میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک مقامی مسلمان مجھ سے ملنے کے لیے ہوٹل میں آئے۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔ وہ اس بچہ کو اپنی گود میں لئے ہوئے تھے۔ وہ بچہ کو کبھی کندھے پر بٹھاتے اور کبھی گود میں لیتے۔ وہ میرے کمرے میں آکر بیٹھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ آپ کا بیٹا ہے۔ انہوں نے خوشی کے لہجہ میں کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے بیٹے کے دشمن ہیں۔ اس کے ساتھ آپ کا پیار اس کے لیے دشمنی کے ہم معنی ہے۔ اس غیر متوقع تبصرہ کو سن کر وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ آپ ہمیشہ اپنے صاحبزادے کو گود میں نہیں رکھ سکتے۔ آخر کار اس کو ایک ایسی دنیا میں جانا ہے جہاں کوئی اس کو گود میں لینے والا نہ ہوگا۔ بچہ کے لیے سچی محبت یہ ہے کہ آپ اس کو مستقبل کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کریں، نہ یہ کہ اس کو اس سے بے خبر رکھ کر ایک ایسی دنیا میں جینے والا بنائیں جو آپ کی گود کے باہر کہیں اپنا وجود نہیں رکھتی۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو ابھی چھوٹا بچہ ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ سوچ فطرت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے بچے کو گود سے اتار دیا۔ اتارتے ہی وہ بچہ زمین پر دوڑنے لگا۔ اس کا حال اس چڑیا جیسا ہو گیا جو پنجرے میں بند ہو اور پنجرہ سے آزاد ہوتے ہی فضا میں اڑنے لگے۔

فطرت کے نظام کے مطابق، بچہ ماں باپ کی گود میں رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوتا۔ بچہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے کھلے میدان میں دوڑے۔ وہ زندگی کی جدوجہد میں داخل ہو۔ وہ ہر قسم کے تجربات سے گزرتے ہوئے اپنے مستقبل کی تعمیر کرے۔ وہ موافق اور مخالف حالات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرے۔ ایسی حالت میں بچے کو ماں باپ کی شفقتوں کا عادی بنانا فطرت کی اسکیم کے خلاف ہے۔ وہ فطرت کے نظام سے لڑنا ہے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ وہ اس فطری حقیقت کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی اولاد کو بنائیں۔

مستقبل پر نظر

ایک صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی دور افتادہ مقام پر ایک نوجوان سے کردی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اس نوجوان کی معاشی حالت بہت کمزور ہے۔ اس کے پاس جو گھر ہے وہ بھی ٹوٹا پھوٹا ہے۔ سماج میں اس کو کوئی ممتاز حیثیت حاصل نہیں۔ لوگوں کو جب اس شادی کا حال معلوم ہوا تو وہ باپ کو برا بھلا کہنے لگے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں یہ کہا کہ وہ دماغی خلل کا شکار ہے۔

مگر باپ نے اس معاملہ میں صبر کا طریقہ اختیار کیا۔ اُس نے صرف یہ کیا کہ وہ برابر اپنی لڑکی کے لیے دعا کرتا رہا۔ وہ یہ دعا کرتا رہا کہ خدایا، میری غلطی کی تلافی فرمائیے، میری لڑکی کی مدد فرمائیے، اس کو اپنی رحمتوں کے سایے میں لے لیجئے۔

اس کے بعد اس لڑکی کے یہاں چند بچے پیدا ہوئے۔ یہ بچے تندرست اور محنتی تھے۔ اُنہوں نے اپنی محنت سے تعلیم حاصل کی اور اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ ان کو اپنی لیاقت کی بنیاد پر اچھی سروس مل گئی۔ اب حالات بدل گئے۔ لڑکوں نے بڑے ہو کر نیا گھر بنایا۔ اُن کے پاس گاڑی اور دوسری چیزیں بھی ہو گئیں۔ اپنے حسن عمل سے انہوں نے سماج میں اچھا مقام حاصل کرلیا۔

اس طرح کی مثالیں ہر سماج میں ہیں۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ انسان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ صرف حال کو دیکھ کر رائے قائم کرے۔ بلکہ اس کو مستقبل پر نظر رکھنا چاہیے۔ اس دنیا میں کوئی بھی محرومی ابدی محرومی نہیں۔ اس دنیا میں ہر انسان کے لیے یہ مواقع موجود ہیں کہ وہ محنت اور لیاقت کا ثبوت دے کر ترقی کی منزلیں طے کرے۔ وہ حال کی کمی کو مزید اضافہ کے ساتھ مستقبل میں پورا کرلے۔

کامیاب شادی کا راز یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی لڑکی کی شادی کسی امیر آدمی سے کریں۔ اسی طرح ناکام شادی یہ نہیں ہے کہ آپ کی لڑکی کی شادی کسی غریب شخص سے ہو جائے۔ اس دنیا میں آج کا امیر کل کا غریب بن جاتا ہے اور آج کا غریب کل کے دن امیر بن جاتا ہے۔ زندگی میں اصل اہمیت محنت اور منصوبہ بندی کی ہے، نہ کہ امیری اور غریبی کی۔

تیسرا انتخاب

۱۸۔ ۱۹ دسمبر ۲۰۰۴ کو میں نے دہلی اور جے پور کے درمیان سفر کیا۔ سفر کے لیے میرے سامنے دو ممکن صورتیں تھیں، ٹرین یا ہوائی جہاز۔ غیر شعوری طور پر میرا ذہن یہ بن گیا کہ یا تو ٹرین سے سفر کرنا ہے یا ہوائی جہاز سے۔ ٹرین (شتابدی ایکسپریس) دہلی سے صبح کے وقت جے پور جاتی تھی اور شام کے وقت جے پور سے دہلی آتی تھی۔ ٹرین کا انتخاب کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ۱۸ دسمبر کی صبح کو جے پور گیا اور ۱۹ دسمبر کی شام کو دہلی واپس آیا۔ اس بنا پر ایسا ہوا کہ ۱۹ دسمبر کا دن میں نے کھو دیا۔ ۱۹ دسمبر کو دہلی میں ایک بہت ضروری پروگرام تھا مگر میں اس میں شرکت نہ کرسکا۔

یہ واقعہ ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) کی بنا پر پیش آیا۔ یعنی صرف دو انتخاب (options) کے درمیان سوچنا۔ بعد کو مجھے احساس ہوا کہ میرے لیے یہاں تیسرا انتخاب بھی تھا۔ وہ یہ کہ میں ۱۸ دسمبر کی صبح کو ٹرین کے ذریعہ جے پور جاؤں، اور ۱۹ دسمبر کی صبح کو سواری بدل کر ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی واپس آؤں۔ ایسی صورت میں میں ۱۹ دسمبر کے پروگرام میں بخوبی شریک ہوسکتا تھا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اکثر ثنائی طرز فکر کا شکار رہتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے لیے صرف دو صورتوں میں سے ایک صورت کا انتخاب ہے۔ حالاں کہ وہاں ایک تیسری صورت بھی موجود رہتی ہے جو زیادہ مفید ہوتی ہے۔

تاریخ کی بہت سی ناکامیاں اسی ثنائی طرز فکر کا نتیجہ تھیں۔ مثلاً بہت سے لوگوں نے اپنے حالات کے ناقص اندازہ کی بنا پر یہ سمجھ لیا کہ ان کے لیے صرف دو ممکن صورتیں ہیں، یا جنگ یا ذلت کی زندگی۔ حالاں کہ وہاں تیسری صورت بھی موجود تھی، اور وہ یہ کہ جنگ کو اوائڈ کرکے امن قائم کرنا اور مواقع کو استعمال کرکے اپنے کو مستحکم بنانا۔ اس حکمت کو نہ جاننے کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے غیر ضروری طور پر اپنے کو تباہ کرلیا، حالاں کہ اگر وہ تیسرے انتخاب کو لیتے تو وہ اس کو استعمال کرکے بہت بڑی کامیابی حاصل کرسکتے تھے۔

کامیاب ازدواجی زندگی

ہرعورت اور مرد کے ذہن میں شادی سے پہلے آئیڈیل شوہر اور آئیڈیل بیوی کا تصور بسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر شادی کے بعد دونوں محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے جس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنایا ہے وہ ان کے آئیڈیل سے کم ہے۔ یہی احساس مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ عورت اور مرد دونوں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کا انتخاب درست نہ تھا۔

اس احساس کے آتے ہی دونوں کے درمیان اختلافات شروع ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ دو میں سے ایک کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تلخ ازدواجی زندگی یا طلاق۔ مگر یہ دونوں ہی یکساں طور پر غلط اور غیر فطری ہیں۔

اصل یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اختلاف کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں کا انتخاب غلط تھا۔ اس کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ دونوں فطرت کی ایک حقیقت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ وہ یہ کہ اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے، وہ کسی خاص عورت یا کسی مرد کا حصہ نہیں۔

یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔ عورت اور مرد دونوں اگر یہ سمجھ لیں کہ اُن کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے وہ خدا کے تخلیقی منصوبہ کی بنا پر پیش آرہا ہے، نہ کہ اُن کے غلط انتخاب کی بنا پر۔ اگر دونوں اس حقیقت کو سمجھ لیں تو ازدواجی زندگی کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔

خالق نے خود اپنے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، ہر دو انسان کے درمیان فرق رکھا ہے۔ اس مسئلہ کا حل فرق کو مٹانا نہیں ہے بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ انسان اس ہنر کو جانے جس کو آرٹ آف ڈیفرنس مینیجمنٹ (art of difference management) کہا جاسکتا ہے۔ ڈیفرنس کو مٹانے کی کوشش نہ کیجیے بلکہ ڈیفرنس کے ساتھ جینا سیکھیے اور پھر آپ کی زندگی کامیاب ازدواجی زندگی بن جائے گی۔

خاندانی زندگی ہو یا سماجی زندگی، دونوں میں اختلافات پیدا ہونا فطری ہے۔ اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے — اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا۔

گھریلو جھگڑے

اکثر گھروں میں اہل خاندان کے درمیان جھگڑے جاری رہتے ہیں۔ یہ جھگڑے زیادہ تر نفسیاتی ہوتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں ان کا کوئی مادی سبب نہیں ہوتا۔ لوگ اگر صبر و اعراض کی حکمت جان لیں تو اس قسم کے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ ہر گھر امن کا گھر بن جائے۔

ایک مشترک خاندان کی مثال ہے۔ وہاں دو بہوئیں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ دونوں کے کام کے لیے دو الگ الگ خادمائیں تھیں۔ دونوں خاداؤں کے درمیان فطری طور پر کبھی کبھی تکرار ہو جاتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ تکرار کے دوران ایک خادمہ نے دوسری خادمہ کو کہہ دیا کہ تمہاری بی بی جی تم کو کچھ نہیں بولتیں اس لیے تم شیطان ہوگئی ہو۔ خادمہ نے اپنی مالکہ سے اس کو نقل کیا تو بات کچھ بدل گئی۔ اس نے اس بات کو ان لفظوں میں نقل کیا: وہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری بی بی جی نے تم کو شیطان بنا دیا ہے۔ اس کے بعد اس خاتون نے اس بات کو جب اپنے شوہر سے نقل کیا تو بات کچھ اور بدل کر اس طرح ہوگئی: تم بھی شیطان، تمہاری بی بی جی بھی شیطان۔ یہ سن کر ان کا شوہر غصہ ہو گیا اور گھر میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ دونوں بہوئیں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔ گھر کا سکون درہم برہم ہو گیا۔

اس طرح کے معاملات میں پہلا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی ان کو نظر انداز کر دے۔ وہ سنی ہوئی بات کا کوئی اثر نہ لے اور نہ اس کو دوسرے سے نقل کرے۔ یہ رویہ اگر اختیار کیا جائے تو مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سننے والا صرف ایک پارٹی کی بات سن کر کوئی رائے نہ بنائے۔ وہ غیر جانبداری کے ساتھ پہلے دونوں پارٹی کی بات سنے اور اس کے بعد ٹھنڈے طریقہ سے ایسی رائے قائم کرے جو انصاف کے مطابق ہو۔ وہ اصل بات کو گھٹانے یا بڑھانے کی غلطی نہ کرے بلکہ بات کو ویسا ہی لے جیسا کہ وہ ہے۔ ان دو طریقوں کے سوا ہر دوسرا طریقہ فساد پیدا کرنے والا ہے، وہ آخر کار پورے خاندان میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب کچھ لوگ مل جل کر رہتے ہیں تو لازمی طور پر ان کے درمیان کچھ خلاف مزاج واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ان باتوں کو لے کر دوسروں سے لڑنا یا جھگڑنا مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ اس قسم کا اختلاف ایک فطری امر ہے اور جو چیز فطری امر کی حیثیت رکھتی ہو اس کو مٹانا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ اس طرح کے مسائل کا حل صبر واعراض ہے نہ کہ ان کو لے کر لڑنا جھگڑنا۔

مزید یہ کہ اس طرح کی باتوں پر آدمی کے اندر جو غصہ بھڑکتا ہے وہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے، وہ آخر کار ختم ہو جانے والا ہے۔ ایسی حالت میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایسی بات پیش آنے کے موقع پر دو منٹ کے لیے چپ رہے، وہ ردّعمل کے بجائے صبر کا طریقہ اختیار کر لے۔ اگر وہ ایسا کرے تو چند منٹ کے بعد اس کا غصہ ختم ہو جائے گا اور وہ اسی طرح ایک معتدل انسان بن جائے گا جس طرح وہ واقعہ سے پہلے ایک معتدل انسان نظر آتا تھا۔

اس معاملہ کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر کچھ مائنس پائنٹ ہوتے ہیں اور کچھ پلس پائنٹ ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مرد یا عورت اس سے خالی نہیں۔ جب کسی آدمی کو غصہ آجائے تو یہ ہوتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے پلس پائنٹ کو بھول جاتا ہے۔ اس کو اس وقت فریق ثانی کا صرف مائنس پائنٹ یاد رہتا ہے۔ یہی ذہنی حالت آدمی کو غیر معتدل بنا دیتی ہے۔ وہ ایسی روش اختیار کر لیتا ہے جس کو وہ معتدل حالت میں اختیار کرنے والا نہ تھا۔

ایسی حالت میں اس مسئلہ کا فطری حل یہ ہے کہ جب بھی کسی کے اندر دوسرے کے خلاف اشتعال پیدا ہو تو وہ اپنے آپ کو کنٹرول کر کے غیر جانب دارانہ انداز میں سوچے۔ وہ فریق ثانی کے پلس پائنٹ کو سوچے یا اس کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو یاد کرے۔ ایسا کرتے ہی یہ ہوگا کہ اس کا انتقامی جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ میں نے ایک شخص کے ۹۹ پہلوؤں کو بھلا دیا اور اس کی شخصیت کے ایک پہلو کو لے کر اس کے خلاف بھڑک اٹھا۔

خاندان میں بگاڑ ہمیشہ کسی چھوٹی بات پر شروع ہوتا ہے۔ اگر شروع ہی میں اُس پر قابو پالیا جائے تو کبھی کوئی مسئلہ بڑا مسئلہ نہ بنے۔

تعلیم کی طرف

بی بی سی لندن کے اردو شعبہ کی ایک ٹیم نے انڈیا کی ریاست گجرات کا دورہ کیا۔ وہاں اس نے خاص طور پر گجرات کے مسلمانوں سے ملاقات کی اور اس موضوع پر ایک رپورٹ تیار کی۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ میں نے ۲۲ جولائی ۲۰۰۴ کو بی بی سی لندن کے نشریہ میں سنا۔ اس نشریہ میں بتایا گیا تھا کہ ریاست میں پچھلے فرقہ وارانہ فساد فروری۔ مارچ ۲۰۰۲ کے بعد گجرات کے مسلمانوں میں بڑے پیانہ پر ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اب یہاں کا ہر مسلمان تعلیم کے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر ایک یہ کہہ رہا ہے کہ اپنے بچوں کو پڑھاؤ۔

یہ ایک نیا رجحان ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں میں مسلسل طور پر ایک ہی ذہن پایا جارہا تھا۔ وہ تھا شکایت اور احتجاج اور تشدد کا جواب تشدد سے دینا۔ نصف صدی سے زیادہ مدت کے تجربہ کے بعد یہ نظریہ ناکام ثابت ہوا۔ اب پہلی بار مسلمانوں میں یہ طرزِ فکر پیدا ہوا ہے کہ جوابی ذہن کے تحت سوچنا اور ماضی کے تلخ تجربوں میں جینا ایک بے فائدہ کام ہے۔ اب وہ پہلی بار پیچھے کو بھلا کر آگے کی طرف سوچ رہے ہیں۔ وہ انتقام کے بجائے تعمیر کا نظریہ اپنا رہے ہیں۔ اس جدید رجحان کو ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: ماضی کو بھلاؤ، بچوں کو پڑھاؤ۔

۱۹۴۷ کے بعد پیش آنے والے ناخوش گوار واقعات کے نتیجہ میں تمام ہندستانی مسلمان ردعمل کی نفسیات کے شکار ہوگئے تھے۔ راقم الحروف نے پہلی بار مسلمانوں کو یہ بتانا شروع کیا کہ زندگی کا راز مثبت سوچ میں ہے نہ کہ منفی سوچ میں۔ ۱۹۶۵ میں یہ کوشش میں نے لکھنؤ کے ہفت روزہ ندائے ملت کے ذریعہ شروع کی۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ سے یہ کام دہلی کے ہفت روزہ الجمعیۃ کے ذریعہ جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ میں میں نے دہلی سے ماہنامہ الرسالہ جاری کیا اور زیادہ منظم انداز میں اس کام کو کرنے لگا۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد میں مسلسل اس کی تائید میں مضامین شائع کیے۔ پورے ملک میں سفر کر کے جلسوں اور اجتماعات کی صورت میں اس مثبت پیغام کو مسلمانانِ ہند تک پہنچایا۔

یہ نقطۂ نظر مسلمانوں کے لیے اجنبی تھا۔ ایک عربی مثل ہے کہ: الناس اعداء ما جھلوا (لوگ اس چیز کے دشمن بن جاتے ہیں جس سے وہ بے خبر ہیں) چنانچہ ابتدائی طور پر مسلمانوں میں اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ وہ صبر اور اعراض کے نظریہ کو دشمن کی چال سمجھنے لگے۔ مگر مسلسل تجربے کے بعد اب ان کی آنکھ کھل گئی ہے۔ اب نہ صرف گجرات بلکہ سارے ملک میں مسلمانوں کا ذہن بدل چکا ہے۔ وہ جان چکے ہیں کہ دوسروں کو الزام دینا سراسر بے فائدہ کام ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ساری طاقت خود اپنے تعمیر واستحکام پر لگائی جائے۔

یہ بلاشبہ ایک صحت مند رجحان ہے۔ سائنسی انقلاب کے بعد دنیا میں مکمل طور پر ایک نیا دور آگیا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ تلوار میں طاقت ہے (ہر کہ شمشیر زند سکہ بہ نامش خوانند) مگر اب ہر باشعور آدمی جانتا ہے کہ طاقت کا راز علم ہے۔ پہلے اگر دنیا میں صاحب شمشیر لوگوں کا غلبہ ہوتا تھا تو اب دنیا میں غلبہ ان لوگوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے جو صاحب علم ہوں۔

یہ دنیا مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے آپ کو تلخ تجربات پیش آئیں گے، اپنوں کی طرف سے بھی اور غیروں کی طرف سے بھی۔ وہ شخص نادان ہے جو تلخیوں کی یاد میں جئے۔ دانشمند وہ ہے جو تلخ یادوں کو بھلائے اور صبر وتحمل کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے مستقبل کی تعمیر میں لگادے۔

تعلیم کا مقصد صرف سروس حاصل کرنا نہیں ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو باشعور بنایا جائے۔ اس دنیا میں سارے مسائل کی جڑ بے شعوری ہے، اور سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ لوگ باشعور ہوں۔ وہ مسائل کی حقیقی نوعیت کو سمجھیں۔ وہ حالات کا بے لاگ تجزیہ کرسکیں۔ وہ اس بات کو جانیں کہ دنیا میں کیا چیز قابلِ حصول ہے، اور وہ کیا چیز ہے جو سرے سے قابلِ حصول ہی نہیں۔

تعلیم آدمی کو بے شعوری سے نکالتی ہے اور اس کے اندر شعور کی صفت پیدا کرتی ہے۔ اس دنیا کی تمام کامیابیاں بلاشبہہ تعلیم یافتہ انسان کے لیے مقدر ہیں۔ تعلیم کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔

سفر کا آغاز

سفر کا آغاز ہمیشہ آج سے ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ اپنے سفر کا آغاز کل سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہی مزاج ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر لوگ غیر مطمئن زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔ وہ اپنا نشانہ پورا کئے بغیر موجودہ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

ہر آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی اس کو کچھ حالات ملتے ہیں۔ اگر بالفرض خارجی طور پر اس کو کچھ چیزیں نہ ملیں تب بھی اس کا اپنا وجود اس کو یقینی طور پر حاصل رہتا ہے۔ زندگی کے سفر کا سب سے زیادہ کامیاب آغاز یہ ہے کہ آدمی جہاں ہے وہیں سے وہ اپنا سفر شروع کر دے۔ وہ حاصل شدہ مواقع کو استعمال کر کے اپنی دنیا بنائے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ جو چیز اس کو ابھی نہیں ملی ہے اس کو پانے کے لیے اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس طریقہ کو ایک لفظ میں پازیٹیو اسٹیٹس کو ازم (positive status quoism) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر حالات موجودہ کو قبول کر لینا اور بروقت جو مواقع (opportunities) موجود ہیں ان کو استعمال کر کے پر امن انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

پیدا ہونے کے بعد آدمی کو بروقت جو کچھ ملا ہوا ہوتا ہے وہ اس کو اپنے حوصلہ کے مقابلہ میں کم معلوم ہوتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ پہلے زیادہ حاصل کرے اور اس کے بعد زندگی کی مثبت تعمیر کی طرف بڑھے۔ مگر یہ سوچ غیر فطری ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ملے ہوئے کو مواقع کی نظر سے دیکھا جائے اور اس کو لے کر فوراً ہی زندگی کی مثبت تعمیر شروع کر دی جائے۔

حاصل شدہ نقشۂ کار کے اندر مثبت جدوجہد کرنے کا نام پازیٹیو اسٹیٹس کو ازم ہے۔ یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ جو لوگ حاصل شدہ نقشۂ کار کو ناکافی سمجھ کر نئے نقشۂ کار کی طرف دوڑیں ان کے لیے اس دنیا میں تباہی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

زندگی کی جدوجہد ہمیشہ ملے ہوئے سے ہوتی ہے۔ جو لوگ نہ ملے ہوئے سے زندگی کی جدوجہد شروع کرنا چاہیں وہ یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ ان کی جدوجہد کبھی شروع ہی نہ ہو۔

غصہ کا نقصان

اگر تاریخ کے تمام واقعات کو اکھٹا کیا جائے اور دیکھا جائے کہ جو کام بگڑا وہ کس لیے بگڑا، اور جو کام بنا وہ کس لیے بنا۔ اس کا جواب یقینی طور پر یہ ملے گا کہ جو کام بگڑے ان سب کے پیچھے غصہ اور نفرت کا عنصر موجود تھا۔ اس کے مقابلہ میں جو کام بنے ان سب کے پیچھے اعتدال پسندی اور عفو و درگزر کا عنصر پایا جاتا تھا۔

جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کے اندر نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے اندر منفی نفسیات اُبھر آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے فطری ذہن کے تحت سوچ نہیں پاتا۔ وہ غیر فطری انداز میں سوچتا ہے اور غیر فطری فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہ ایک مسلّم بات ہے کہ فطرت کے راستہ سے ہٹ کر جو کام کیا جائے اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔

اس کے برعکس جب ایسا ہو کہ آدمی کو غصہ آئے تو وہ اپنے آپ کو سنبھال لے۔ وہ اپنی عقل کی صلاحیت کو معتدل انداز میں استعمال کرے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی سوچ فطرت کے دائرہ میں رہتی ہے۔ وہ اپنے عمل کا جو منصوبہ بناتا ہے وہ فطرت کے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ اس بنا پر فطرت کا پورا نظام اس کی موافقت پر آجاتا ہے۔ اور جس آدمی کو فطرت کے نظام کی موافقت حاصل ہو جائے اس کی کامیابی اُتنی ہی یقینی ہے جتنا کہ رات کے بعد روشن صبح کا آنا۔

غصہ ایک آگ ہے۔ صبر و تحمل اس آگ کو بجھا دینے والا ہے۔ غصہ اگر روکا نہ جائے تو وہ نفرت اور تشدد پیدا کرتا ہے اور نفرت اور تشدد ایک ایسی برائی ہے جس سے زیادہ بڑی برائی شاید اور کوئی نہیں۔ صبرِ و تحمل کے ذریعہ اعلیٰ انسانی شخصیت بنتی ہے۔ اور بے صبری اور عدم برداشت انسان کو اخلاقی پستی میں گرا دینے والی ہے۔

غصہ منفی ذہن پیدا کرتا ہے اور غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہونا مثبت ذہن کی تشکیل کرتا ہے۔ مثبت سوچ اعلیٰ انسانیت کی پہچان ہے، اور منفی سوچ پست انسانیت کی پہچان۔

زندگی کے دوطریقے

دنیا میں زندگی گذارنے کے دوطریقے ہیں۔ایک یہ کہ آدمی کسی قائم شدہ نظام سے اپنے آپ کووابستہ کرلے۔ مثلاً وہ کسی کمپنی کا ملازم بن جائے یا حکومت میں کوئی سروس حاصل کرلے یا کسی بڑے ادارہ کا کارکن بن جائے ، وغیرہ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خود اپنی سوچ کے تحت ایک کام شروع کرے۔ وہ خود اپنے نقشہ کے مطابق ، دنیا میں جینا چاہے۔ دونوں ہی کی ایک قیمت ہے اور کوئی آدمی اُسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب کہ وہ اس کی قیمت ادا کرے، خواہ وہ کسی رائج نظام کا معاملہ ہو یا خود اپنے سوچے ہوئے نقشہ کا معاملہ۔ قائم شدہ نقشہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں آدمی کو بہت جلد سہولت کی ایک زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔مگر اس کی قیمت یہ ہے کہ آدمی کا ذہنی ارتقاء رُک جاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں اپنے نقشہ پر چلنے پر بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک چیلنج بھرا راستہ ہے۔ مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں آدمی کو وہ فکری نعمت حاصل ہوتی ہے جس کو ذہنی ارتقاء (intellectual development) کہا جاتا ہے۔

زندگی کے یہ دونوں طریقے درست طریقے ہیں۔ آدمی دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرسکتا ہے۔ البتہ آدمی کو جاننا چاہیے کہ دونوں ہی طریقوں میں ایسا ہے کہ وہ ایک چیز کو پائے گا مگر وہ دوسری چیز کو کھودے گا۔ چیلنج سے خالی راستہ میں مادی سہولت ملے گی، مگر وہاں ذہنی ارتقاء کا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے مقابلہ میں چیلنج والی زندگی میں ذہنی ارتقاء حاصل ہوگا لیکن مادی سہولت کے حصول کا معاملہ غیر یقینی ہو جائے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے جس راستہ کو اختیار کرے، یہ سمجھ کر اختیار کرے کہ اس میں وہ کیا کھوئے گا اور کیا پائے گا۔ کیا چیز اس کو ملے گی اور کیا چیز اُس کو نہیں ملے گی۔ یہی حقیقت پسندی ہے اور یہی اس دنیا میں پُرسکون زندگی حاصل کرنے کا کامیاب اُصول بھی۔ ہر ترقی کی ایک قیمت ہے اور کوئی ترقی وہی شخص پاتا ہے جو اس کی قیمت ادا کرے۔

مسئلہ کا حل

اکثر لوگ منفی نفسیات میں جیتے ہیں۔ وہ مسائل کے حوالہ سے شکایت کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کوئی ایسا نسخہ دریافت کرلیں جو مسائل کو ختم کرنے والا ہو۔ تاکہ انہیں سکون کی زندگی حاصل ہو سکے۔ یہ ذہن فطرت کے قانون کے خلاف ہے، اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ کبھی حاصل ہونے والی نہیں۔

مسائل زندگی کا حصہ ہیں، وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ مسئلہ کا حل مسئلہ کے ساتھ جینا ہے، نہ کہ مسئلہ کو ختم کرکے بے مسئلہ زندگی حاصل کرنا۔ کوئی چیز اُسی وقت تک مسئلہ نظر آتی ہے جب کہ اس کو مسئلہ سمجھا جائے۔ اگر مسئلہ کو زندگی کا لازمی حصہ سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد مسئلہ معمول کی چیز بن جائے گا، وہ پریشان کن مسئلہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بے مسئلہ زندگی اور با مسئلہ زندگی کے درمیان انتخاب نہیں ہے بلکہ یہاں انسان کے لیے صرف ایک ہی انتخاب ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ با مسئلہ زندگی کو معمول کی چیز سمجھ کر اس پر راضی ہو جائے۔ مسئلہ کے بارے میں وہ اپنی منفی سوچ کو ختم کردے۔

مسئلہ کیا ہے۔ مسئلہ دراصل اجتماعی زندگی کی قیمت ہے۔ انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ اجتماعی زندگی گذارے اور جب بھی وہ اجتماعی زندگی میں رہے گا تو اس کے ساتھ مسائل بھی ضرور پیش آئیں گے۔ انفرادی زندگی بے مسئلہ زندگی ہو سکتی ہے۔ مگر انفرادی زندگی گذارنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ انسانی تقاضے صرف اجتماعی زندگی میں پورے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ مسئلہ کو اجتماعی زندگی کے لازمی جزء کی حیثیت سے قبول کرے۔

مسئلہ زندگی کی سرگرمیوں سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں سرگرمیاں ہوں گی وہاں مسائل بھی لازمی طور پر پائے جائیں گے۔ مسئلہ کو مسئلہ نہ سمجھنا ہی مسئلہ کا واحد یقینی حل ہے۔ مسئلہ کا حل ہمیشہ آدمی کے ذہن میں ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر۔

دو درجے

زندگی میں کامیابی کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے اوسط درجہ کی کامیابی۔ اور دوسرا ہے اعلیٰ درجہ کی کامیابی۔ اس دنیا میں دونوں ہی ممکن ہے۔ مگر دونوں کی شرطیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے — چھوٹی کوشش چھوٹی کامیابی، بڑی کوشش بڑی کامیابی۔

جہاں تک چھوٹی کامیابی یا اوسط درجہ کی کامیابی کا معاملہ ہے وہ ہر شخص حاصل کر لیتا ہے۔ ہر آدمی کے حالات اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرے۔ اس طرح ضرورت کے تقاضے کے تحت ہر آدمی کوئی نہ کوئی کام کر لیتا ہے۔ خواہ وہ سروس ہو یا کوئی آزاد تجارت۔

مگر بڑی کامیابی زیادہ بڑی کوشش سے ملتی ہے۔ بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر بڑی سوچ ہو۔ وہ زیادہ معلومات رکھتا ہو۔ وہ منصوبہ بندی کے اصول کو اختیار کرے۔ اس کے اندر بلند اخلاقی صفات ہوں۔ وہ صبر وتحمل کے ساتھ کام کرنا جانتا ہو۔ اس کے معاملات معلوم اصول کی بنیاد پر قائم ہوں۔ وہ لوگوں کے اندر بے ضرر اور نفع بخش بن کر رہے۔

اس دنیا میں ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اسی طرح کامیابی کی بھی ایک قیمت ہے۔ جو شخص بڑی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو جاننا چاہیے کہ بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس کو بڑی قیمت بھی دینی پڑے گی۔ چھوٹی قیمت دے کر بڑی کامیابی حاصل کرنا اس دنیا میں ممکن نہیں۔

بڑی کامیابی کا مطلب ہے، دنیا سے زیادہ لینا۔ فطرت کا اصول ہے کہ جو شخص دنیا سے زیادہ لینا چاہتا ہو اس کو اپنی طرف سے بھی زیادہ دینا پڑے گا۔ اس دنیا میں کسی کو بھی دیے بغیر کچھ نہیں مل سکتا۔ کامیابی ایک دوطرفہ عمل ہے۔ وہ کسی کے لیے بھی یک طرفہ عمل نہیں۔

کامیابی کے دو درجے ہیں اور دونوں ہی درجے اہم ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ میں باشعور ہو۔ اس کے بعد اس کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

برداشت کرنا واحد حل

زندگی ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ زندگی مسائل اور مصائب کا مجموعہ ہے۔ زندگی کا سفر ہمیشہ محرومیوں کے درمیان طے ہوتا ہے۔ ہر آدمی مجبور ہے کہ وہ ناخوشگوار یادوں کے درمیان زندگی گزارے۔ یہ صورت حال ہر ایک کے لیے ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ وہ با اختیار ہو یا بے اختیار۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

ایسی حالت میں پر اطمینان زندگی کا فارمولا کیا ہے۔ وہ فارمولا صرف ایک ہے۔ تلخ یادوں کو ذہن سے نکالتے رہنا۔ ماضی اور حال کو بھلا کر مستقبل پر نظر رکھنا۔ جو ملا اس پر مطمئن رہنا اور جو نہیں ملا اس کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ وہ ملنے والا ہی نہ تھا۔

دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں۔ ہر انسان مجبور ہے کہ وہ ایک بڑے انسانی مجموعے میں زندگی گزارے۔ یہی اجتماعیت زندگی کے تمام مسئلے پیدا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں خود مسئلہ کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ کہ مسائل کے ساتھ جینے کا فن سیکھا جائے۔

فطرت نے انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں سے ایک صلاحیت وہ ہے جس کو بھلانا یا فراموش کرنا کہا جاتا ہے۔ انسان جب کسی یاد کو زندہ حافظہ میں نہ رکھے، وہ اپنے دماغ کو دوسری باتوں میں مشغول کر کے اس کو بھلانے کی کوشش کرے تو بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات دماغ کے پچھلے خانہ میں چلی جاتی ہے۔ حافظہ کے ریکارڈ میں اگر چہ وہ اب بھی موجود ہوتی ہے مگر اس کے بعد ایسا نہیں ہوتا کہ وہ تلخ یاد بن کر ہر وقت آدمی کو ستاتی رہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے۔ اس نظام کو استعمال کر کے تلخ یادوں کی کڑواہٹ کو دور کیا جا سکتا ہے۔ تلخ یادوں کو بھلانا بظاہر ایک مشکل کام ہے مگر تلخ یادوں کے مسئلہ کا اس سے زیادہ آسان حل اور کوئی نہیں۔

برداشت کوئی مجبوری نہیں، برداشت زندگی کا ایک اصول ہے۔ برداشت بہادری کی روش ہے، نہ کہ بزدلی کی روش۔

سب سے بڑی طاقت

لوگ سمجھتے ہیں کہ سب سے بڑی طاقت جنگ جوئی کی طاقت ہے۔ یعنی لوگوں سے نہ دبنا، لوگوں سے سختی کے ساتھ معاملہ کرنا، اگر ضرورت پڑے تو لوگوں کے خلاف تشدد کا طریقہ استعمال کرنا۔ عام طور پر لوگ اس کو طاقت سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس قسم کا خیال فطرت کے نقشہ کے سراسر خلاف ہے۔

فطرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سختی کے مقابلہ میں نرمی کا طریقہ زیادہ مؤثر ہے۔ نرمی کا طریقہ اختیار کر کے آپ انسان کو جیت لیتے ہیں۔ کسی کو زیر کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر اصول یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جو اس کے ضمیر کو آپ کا ہمنوا بنا دے۔ یہ فائدہ صرف نرمی کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔

اس مفہوم میں اپنے آپ کو طاقتور بنانے کا ایک آسان فارمولا یہ ہے کہ آپ غلطی کے اعتراف کی عادت ڈالیں۔ جب کسی کے ساتھ آپ کی تکرار ہو جائے اور آپ محسوس کریں کہ آپ غلطی پر تھے تو عزت کا خیال کیے بغیر فوراً یہ کہہ دیجئے کہ آپ صحیح ہیں اور میں غلط ہوں:

You are right, I am wrong.

یہ اعتراف دراصل خود اپنی تربیت ہے۔ اعتراف آدمی کے اندر تواضع کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ فطرت کے مطابق، بے اعترافی سرکشی کی غذا ہے اور اعتراف تواضع کی غذا۔ جو آدمی اعتراف نہ کرے وہ گویا اپنے اندر چھپی ہوئی انانیت اور سرکشی کو غذا دے رہا ہے۔ وہ اپنی انانیت اور سرکشی کو زیادہ پختہ کر رہا ہے۔ ایسا آدمی سب سے بڑی طاقت سے محروم ہو جائے گا۔

اس کے برعکس جو آدمی غلطی کے وقت فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لے وہ اپنے اندر تواضع کی پرورش کر رہا ہے۔ وہ اپنی تواضع کو غذا دے کر اس کو اور زیادہ بڑھا رہا ہے۔ وہ اپنے اندر تواضع کی صفت کو اور زیادہ مستحکم کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اپنے آپ کو طاقتور سے طاقتور تر بنا رہا ہے۔

مسائل اور ان کا حل

انسان کے ساتھ جو مسائل پیش آتے ہیں ان کا بنیادی سبب اجتماعیت ہے۔ زمین پر اگر صرف ایک انسان موجود ہوتا تو یہاں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا مگر انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ اجتماعی طور پر زندگی گزارتا ہے۔ یہ اجتماع ہی تمام مسائل کی اصل جڑ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کا حل یہ ہے کہ فرد اور اجتماع کے درمیان موافقت تلاش کی جائے۔ جب بھی کسی شخص کو کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو اس کا سبب ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے وہ یہ کہ آدمی صرف اپنی ذاتی خواہش کے مطابق مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بہت سے دوسرے لوگوں کے درمیان ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کو نظر انداز کر کے یک طرفہ خواہش کی بنیاد پر اپنا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔ یہی انسانی مسائل کا اصل سبب ہے اور اسی سبب کی رعایت کر کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ آپ کا نظریہ یہ ہے کہ سیدھے ہاتھ کی طرف چلنا زیادہ بہتر ہے۔ آپ اگر اس بے لچک نظریہ کو لے کر سڑک پر اپنی گاڑی دوڑانے لگیں تو آپ اپنی منزل کی بجائے صرف قبرستان تک پہنچیں گے۔ آپ کے عقیدہ کے مطابق، دائیں طرف چلنا سیدھی طرف چلنا ہے اور بائیں طرف چلنا الٹی طرف چلنا ہے۔ یہ عقیدہ آپ کے نزدیک خواہ کتنا ہی درست ہو مگر یہ عقیدہ کامیاب سفر کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ آپ کو اس معاملہ میں اپنے اندر لچک پیدا کرنا ہوگا۔ سڑک پر چلتے ہوئے آپ کو ٹرافک رول کے اجتماعی قواعد کی پابندی کرنی ہوگی۔ اجتماعیت کے اندر کامیاب زندگی حاصل کرنے کا یہی واحد اصول ہے۔

اجتماعی زندگی ملی جلی زندگی کا نام ہے۔ کسی سماج کا ہر فرد اس اجتماعیت سے جڑا ہوا ہے۔ اسی اجتماعی تقاضہ کی رعایت کا نتیجہ کامیابی ہے اور اسی اجتماعی تقاضہ کی رعایت نہ کرنے کا نتیجہ ناکامی۔

مسئلہ بظاہر دوسرے شخص کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کا حل ہمیشہ اپنی ذات میں ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو حقیقت پسند بنانا ہی کسی مسئلہ کا واحد یقینی حل ہے۔

منفی پہلو میں مثبت پہلو

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں برٹش راج تھا۔ اُس زمانہ میں برٹش حکمرانوں نے ہندستان میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنایا اور پوری طاقت سے انگریزی زبان کو ہندستان میں رائج کیا۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان کے اعتبار سے امریکا اور برطانیہ کے بعد ہندستان تیسرا سب سے بڑا ملک بن گیا۔

برٹش حکمرانوں نے اپنے خیال کے مطابق، ہندستان میں انگریزی زبان کو اس لیے رائج کیا تھا کہ وہ اس ملک پر ہمیشہ کے لیے اپنا غلبہ قائم رکھیں۔ برٹش حکومت نے انگریزی زبان کو صرف اپنے مفاد کے لیے یہاں جاری کیا تھا۔ مگر آج یہی انگریزی زبان ہمارے ملک کے لیے سب سے بڑا سرمایہ بن گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انفارمیشن ٹکنالوجی تمام تر انگریزی زبان پر قائم ہے اور انگریزی زبان میں ہندستان دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت آگے ہے۔ چین اور روس دونوں بہت بڑے ملک ہیں۔ مگر دونوں ہندستان سے کہہ رہے ہیں کہ ہم کو تمہاری انگریزی کی ضرورت ہے، ہمیں اپنی انگریزی اکسپورٹ کرو۔

اس مثال سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کا حریف خواہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوئی عمل کرے مگر عین ممکن ہے کہ مستقبل کے لحاظ سے وہ تمام تر آپ کے فائدے میں ہو۔ حتیٰ کہ حریف اگر آپ کے خلاف کوئی سازشی منصوبہ بنائے تب بھی یہ امکان باقی رہے گا کہ اس کی سازش آپ کے لیے ترقی کا ایک زینہ بن جائے۔ حریف کی بنائی ہوئی دنیا آخر کار آپ کے حصہ میں آجائے۔

اس دنیا میں ہر منفی واقعہ میں مثبت پہلو موجود رہتا ہے۔ اگر آپ اس مثبت پہلو کو دریافت کرسکیں تو آپ کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مثبت پہلو کی دریافت آپ کو اپنی تعمیر میں اتنا زیادہ مشغول کردے گی کہ آپ کے پاس دوسروں کے خلاف لکھنے اور بولنے کے لیے وقت ہی نہ رہے۔

خاندانی زندگی

شادی شدہ زندگی کو خوشگوار بنانے کا راز کیا ہے۔ وہ صرف ایک ہے — ناخوشگواری میں خوشگواری کو دریافت کرنا۔ ناپسندیدہ صورت حال کو اپنے لیے پسندیدہ بنا دینا۔ اس کو ایک لفظ میں یہ کہہ سکتے ہیں:

The art of situation management

اصل یہ ہے کہ کوئی بھی عورت یا مرد اسٹیچو نہیں ہوتے۔ فطری نقشہ کے مطابق، ہر عورت اور ہر مرد کی سوچ الگ ہوتی ہے۔ ہر ایک کا ذوق ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک اور دوسرے کے درمیان یہی وہ فرق ہے جو دونوں کے درمیان ناخوشگواری پیدا کرتا ہے۔

جب ایسا ہوتا ہے تو دونوں فریق یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ اس کا ذمہ دار فریق ثانی کو بنا لیتے ہیں اور پھر اس سے جھگڑنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ فرق و اختلاف کی جو صورت حال پیدا ہوئی ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فطرت کی پیدا کی ہوئی ہے نہ کہ کسی عورت یا کسی مرد کی۔ اگر دونوں اس راز کو سمجھ لیں تو کوئی مسئلہ زیادہ شدت اختیار نہ کرے، ہر مسئلہ اپنی حد کے اندر رہے اور دونوں فریق اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیں۔

انسانوں کے درمیان فرق و اختلاف کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک خوبی ہے۔ اسی فرق و اختلاف سے ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ڈائیلاگ ہوتا ہے۔ بحث و گفتگو کے دوران معاملہ کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ اختلاف ذہنی ترقی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اگر لوگوں کے درمیان اختلاف نہ ہو تو زندگی جمود کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

فطرت نے اپنی تقسیم میں یہ طریقہ رکھا ہے کہ کسی کے اندر ایک صلاحیت ہوتی ہے اور کسی کے اندر دوسری صلاحیت۔ اگر فرق و اختلاف کو نظر انداز کیا جائے تو ہر ایک کی صلاحیت استعمال ہونے لگے گی۔ ہر ایک اپنی اضافی لیاقت کے ذریعہ دوسرے کے لیے قیمتی مددگار بن جائے گا۔ ہر ایک دوسرے کی کمی کی تلافی کرنے لگے گا۔

تحفہ کی نفسیات

ایک سفر میں میری ملاقات کویت کے ایک عرب پروفیسر سے ہوئی۔ ان کے ہاتھ پر ایک خوبصورت گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے ٹائم پوچھا تو وہ اپنی گھڑی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ کویت میں تو اچھی گھڑیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ کا کہنا صحیح ہے مگر یہ تحفہ کی گھڑی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تحفہ کی نفسیات یہ ہے کہ لوگ خوش نما چیز دیتے ہیں نہ کہ کارآمد چیز۔

تحفہ کے بارے میں یہ عام مزاج ہے۔ تحفہ میں اکثر لوگ کئی چیزیں دیتے ہیں مگر ہر چیز ناقص ہوتی ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ جو پیسہ چار چیزوں میں لگایا گیا ہے اس سے صرف ایک چیز خریدی جائے اور اس کو تحفہ میں دیا جائے۔ تحفہ کا مقصد یہ ہے کہ آپس میں دوستی بڑھے، آپس میں ایک دوسرے کے درمیان اعتماد قائم ہو۔ لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ بن کر زندگی گذاریں مگر مذکورہ قسم کے تحفہ کا نتیجہ ہمیشہ الٹا ہوتا ہے۔ نمائشی مزاج کے تحت دیا ہوا تحفہ کبھی کسی حقیقی فائدہ کا سبب نہیں بن سکتا۔ نمائشی تحفہ صرف ایک دوسرے کے درمیان تلخی اور بے اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ ایسا تحفہ کبھی محبت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

تحفہ پانے والا جب دیکھتا ہے کہ تحفہ دینے والے نے اپنے بیٹے اور اپنی بیٹی کو تو کارآمد تحفہ دیا ہے اور مجھ کو صرف نمائشی تحفہ دے دیا ہے تو ایسا تحفہ صرف بیزاری پیدا کرتا ہے۔ تحفہ پانے والا تحفہ دینے والے کے بارے میں سخت بدگمان ہو جاتا ہے۔ تحفہ دینے والے کے بارے میں اس کی رائے خراب ہو جاتی ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ یا تو تحفہ نہ دیا جائے، یا اگر تحفہ دینا ہے تو اچھا اور کارآمد تحفہ دیا جائے جس کو لے کر تحفہ پانے والا خوش ہو۔ اگر لوگ یہ کرتے ہیں کہ ایک شخص سے انہیں ایک نمائشی تحفہ ملا اور پھر اس کو انہوں نے کسی دوسرے کے حوالہ کر دیا۔ تحفہ دینے والے کو جاننا چاہیے کہ یہ بات کبھی چھپتی نہیں۔ تحفہ پانے والا کسی نہ کسی طرح اس کو جان لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحفہ دینے والے کے بارے میں اگر تحفہ پانے والے کی رائے اچھی تھی تو اب اس کے بارے میں اس کی رائے خراب ہو جاتی ہے۔

ایک نصیحت

ایک مسلم لڑکی نے مجھ سے ملاقات کی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے کہا کہ میرے باپ نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے اور اب جلد ہی میری شادی ہونے والی ہے۔ شادی کے بعد مجھے ایک مشترک خاندان میں رہنا ہوگا۔ میں ڈرتی ہوں کہ آئندہ کیا ہوگا۔ سسرال والے میرے ساتھ اچھا سلوک کریں گے یا برا سلوک کریں گے۔ یہ سوچ کر میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ کی کنجی خود آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس دنیا کا اُصول یہ ہے کہ جیسا دینا ویسا پانا۔ آپ اگر چاہتی ہیں کہ دوسرے لوگ آپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو آپ کو خود بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ یہ فطرت کا اُصول ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ آپ اگر دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو دوسرے لوگ اس کا تحمل نہیں کر سکتے کہ وہ آپ کے ساتھ برا سلوک کریں۔

پھر میں نے کہا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خود تو اچھا سلوک نہیں کرتا مگر وہ دوسروں سے اچھے سلوک کی امید کرنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو عملاً تو اچھا سلوک نہیں کرتے مگر خود ساختہ طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا سلوک دوسروں کے ساتھ اچھا ہے۔ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ اگر دوسرے لوگ آپ کے سلوک کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتے ہوں تو آپ یقین کر لیجئے کہ آپ کا سلوک ویسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے لوگ بتاتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ خوش فہم نہ بنیں بلکہ حقیقت پسند بنیں۔ اس کے بعد آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

مسئلہ کا حل ہمیشہ آدمی کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ مگر وہ اس کو اپنے سے باہر تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہی مزاج اصل مسئلہ ہے۔ کسی مسئلہ کے حل میں اس سے بڑی کوئی اور رکاوٹ نہیں کہ آپ اس کا ذمہ دار دوسروں کو بتا کر دوسروں سے اس کے حل کا مطالبہ کرنے لگیں۔ ہر مسئلہ کی کنجی آپ کے اپنے پاس ہے، نہ کہ کسی دوسرے کے پاس۔

مثبت سوچ کی ضرورت

تمام ناکامیوں کا سبب منفی سوچ ہے اور تمام کامیابیوں کا سبب مثبت سوچ — یہی ایک لفظ میں زندگی کا خلاصہ ہے۔ منفی سوچ والا آدمی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا اور اگر وہ بظاہر کامیاب دکھائی دے تو اس کی کامیابی وقتی ہوگی۔ اس کے برعکس مثبت سوچ والے آدمی کے لیے کامیابی پائیدار بھی ہے اور یقینی بھی۔

منفی سوچ کیا ہے اور مثبت سوچ کیا۔ منفی سوچ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جانے مگر وہ دوسروں کو نہ جانے۔ وہ مسائل کو جانے مگر وہ مواقع کو نہ جانے۔ وہ حال کو جانے مگر وہ مستقبل سے بے خبر ہو۔ وہ اپنے قریبی حالات کو جانے مگر وہ دور کے حالات سے باخبر نہ ہو۔

منفی سوچ والے آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنی خول میں جیتا ہے۔ اُس کے ذہن کے اندر جو خیال آجائے اُسی کو وہ اصل حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ وہ اپنی نفسیاتی پیچیدگی کی بنا پر اس قابل نہیں ہوتا کہ اُس کے ذہن کے باہر جو حقیقتیں ہیں اُن کو جانے اور ان کی روشنی میں زیادہ درست رائے قائم کرے۔ منفی سوچ دراصل بند سوچ کا دوسرا نام ہے۔

اس کے مقابلہ میں مثبت سوچ وہ ہے جو کھلی سوچ ہو۔ مثبت سوچ والا آدمی تعصّبات سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ وہ معاملات میں بےلاگ رائے قائم کرتا ہے۔ اس کی رائے ہمیشہ انصاف پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ وہی سوچتا ہے جو ازروئے واقعہ اس کو سوچنا چاہیے اور وہی بولتا ہے جو ازروئے واقعہ اس کو بولنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مثبت سوچ والے آدمی کی راہیں کبھی بند نہیں ہوتیں، جب کہ منفی سوچ والے آدمی کو ہر طرف اپنی راہیں بند دکھائی دیتی ہیں۔

منفی سوچ مایوسی کی سوچ ہے اور مثبت سوچ امید کی سوچ۔ منفی سوچ راستہ کو بند حالت میں دیکھتی ہے، جب کہ مثبت سوچ والے آدمی کو ہر طرف راستے کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثبت سوچ بصیرت ہے اور منفی سوچ بےبصیرتی۔

غلط فہمی

سماج ایک ایسے انسانی مجموعہ کا نام ہے جہاں بہت سے لوگ مل جُل کر رہتے ہیں۔ فطرت کے نظام کے تحت ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے۔ ہر ایک کا فائدہ الگ الگ ہوتا ہے۔ ہر ایک کا میدانِ عمل الگ الگ ہوتا ہے۔ ہر ایک کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔ اس بنا پر بار بار آپس میں شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ شکایتیں بڑھتے بڑھتے دشمنی تک پہنچ جاتی ہیں اور پھر مزید تلخ واقعات پیدا ہوتے ہیں۔

ان شکایتوں کا سبب زیادہ تر حالات میں صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ غلط فہمی ہے۔ غلط فہمی (misunderstanding) اتنی زیادہ عام ہے کہ وہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ خاندان میں، ادارہ میں، پڑوس میں، یہاں تک کہ قومی اور بین اقوامی سطح پر بھی۔ غلط فہمی اکثر بے بنیاد ہوتی ہے، کسی سماج میں اکثر اجتماعی نزاعات غلط فہمی ہی کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔

غلط فہمی کیا ہے۔ غلط فہمی دراصل ناقص واقفیت کی بنا پر کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کسی کے بارہ میں ایک بات سنتے ہیں اور اُسی کی بنیاد پر اُس کے بارے میں اپنی رائے بنا لیتے ہیں۔ یہی مزاج اکثر حالات میں غلط فہمی کا سبب ہوتا ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کسی شخص کے بارے میں کوئی منفی بات ذہن میں آئے یا کوئی بری بات معلوم ہو تو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ فوراً ہی اس کو درست مان لیا جائے۔ اس کے بجائے ضروری ہے کہ اس کی پوری تحقیق کی جائے۔ تمام ضروری پہلوؤں کو جانچنے سے پہلے ہرگز اس کو مان نہ لیا جائے۔ اس طرح کے معاملہ میں آدمی کے لیے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے یا تو وہ سنی ہوئی بات پر دھیان نہ دے، وہ اس کو نظر انداز کر دے اور کسی سے اس کا چرچا نہ کرے۔ یہ اس طرح کے معاملہ میں محفوظ طریقہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس طرح کی بات پر بولنا چاہتا ہے یا اس کا چرچا کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی تحقیق کرے۔ تحقیق میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ صاحبِ معاملہ سے اس کی حقیقت معلوم کرے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد ہی وہ اس پر بولنے کا حق رکھتا ہے۔

صبر کا فائدہ

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے شکایت ہو جاتی ہے۔ ایک کی کسی بات سے دوسرے کے اندر غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک کا کوئی رویہ دوسرے کے اندر انتقامی جذبات بھڑکا دیتا ہے۔ ایسے موقع پر اکثر لوگ بدلہ کے ذہن سے سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنی بے عزتی پر چپ ہو جائیں تو یہ ہماری غیرت کے خلاف ہوگا۔ یہ حمیت اور غیرت سے سودا کرنے کے ہم معنٰی ہوگا۔

مگر یہ سوچ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا موقع ذلت کا موقع نہیں بلکہ وہ فکری اور روحانی ترقی حاصل کرنے کا موقع ہے۔ غصہ کے موقع پر صبر کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دراصل خود اپنی تربیت کا موقع ہے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنے کا موقع ہے کہ آدمی اپنی داخلی شخصیت کو اتنا مضبوط بنائے کہ وہ خارجی حالات سے اثر لیے بغیر زندہ رہ سکے۔

جو آدمی غصہ اور نفرت اور اشتعال میں مبتلا ہو جائے وہ اپنی اس روش سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ وہ خارجی اشتعال انگیزی کے وقت غیر متاثر نہ رہ سکا۔ ایسے آدمی کا ذہنی اور روحانی سفر رک جائے گا۔ اس کی شخصیت میں فکری ارتقاء کا عمل جاری نہ ہو سکے گا۔

اس دنیا میں پانے کی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کا فکر مسلسل ترقی کر رہا ہو۔ اسی فکری ترقی سے روحانی ترقی بھی جڑی ہوئی ہے۔ جہاں فکری ارتقاء ہوگا وہاں روحانی ترقی بھی ضرور پائی جائے گی۔ اور یہ فکری ارتقاء اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنائے کہ وہ منفی سوچ کو اپنے اندر داخل ہونے سے روک دے۔

صبر دراصل خود اپنے فکری اور روحانی ترقی کی قیمت ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی چیز ضروری قیمت کے بغیر نہیں ملتی۔ اسی طرح فکری اور روحانی ترقی بھی اس خوش قسمت انسان کا حصہ ہے جو صبر کی صورت میں اس کی قیمت دے سکے۔

مشورہ کی اہمیت

ایک مسلم نوجوان نے ایک تعلیم یافتہ خاتون سے شادی کی۔ یہ لوگ کچھ برسوں تک ایک ساتھ رہے۔۔ پھران کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ بیوی اپنے دونوں بچوں کو لے کر اپنے میکہ چلی گئی۔ اب دونوں کے درمیان ایک بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ دونوں طرف سخت باتیں ہونے لگیں۔

اس طرح کا موقع بحران کی تنظیم (crisis management) کا موقع ہوتا ہے۔ بحران کو اگر حکمت کے ساتھ دور کرلیا جائے تو وقتی تلخی کے بعد دوبارہ دونوں کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ لیکن اگر بحران کو درست طور پر حل نہ کیا جائے تو معاملہ اور زیادہ بڑھ جائے گا اور پوری زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

جب کوئی شخص بحران میں مبتلا ہو تو وہ خود زیادہ معتدل انداز میں سوچ نہیں پاتا۔ وہ منفی سوچ یا انتہا پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے۔ ایسے وقت میں صاحب معاملہ کے ساتھیوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر معاملہ کی نزاکت کو سمجھیں اور بحران میں مبتلا شخص کو صحیح مشورہ دیں۔ مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ بحران کی حالت میں مشورہ دینے والے خود بھی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مثلاً مذکورہ معاملہ میں جو شخص بحران میں مبتلا ہوا اس کے کچھ ساتھیوں نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ تم موجودہ بیوی کو طلاق دے دو اور دوسری شادی کرلو۔ مگر یہ مشورہ سخت تباہ کن تھا۔ اس مشورہ پر عمل کرنے کا یقینی نتیجہ یہ تھا کہ آدمی چھوٹے مسئلہ سے نکل کر زیادہ بڑے مسئلہ میں اپنے آپ کو مبتلا کر دے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اس آدمی کو مشورہ دیا کہ تم یک طرفہ بنیاد پر اپنی بیوی کے ساتھ مصالحت کرو۔ اپنی زبان پر کنٹرول رکھو۔ بیوی کو یا اس کے رشتہ داروں کو ہرگز برا نہ کہو اور پھر بیوی کے ساتھ معتدل انداز میں نئی زندگی شروع کردو۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اب دونوں پرسکون طور پر ایک گھر میں رہ رہے ہیں۔

دو کشتی کی سواری

اکثر لوگوں میں یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ واضح انداز میں سوچ نہیں پاتے۔ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔ اس بنا پر اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ بیک وقت دو کشتی کی سواری کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ دو کشتی کی سواری عملاً ممکن نہیں۔

مثلاً ایک شخص برصغیر ہند میں پیدا ہوتا ہے پھر وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک سماج سے نکل کر دوسرے سماج میں جانے کا نام ہے۔ برصغیر ہند کے اندر پابند سماج کا ماحول ہے تو امریکا میں بے قید سماج کا ماحول ہے۔ مگر مذکورہ شخص امریکا میں قیام کرنے کے باوجود یہ چاہتا ہے کہ اس کے بچے وہاں کے بے قید سماج سے متاثر نہ ہوں۔ اس کے بچے وہاں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا کلچر اختیار نہ کریں۔ مگر یہ دو کشتی کی سواری ہے اور دو کشتی کی سواری عملاً ممکن نہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنے بچوں کے بارے میں خلاف امید تجربات پیش آتے ہیں۔ آدمی پیسہ کی فراوانی کے باوجود ذہنی اضطراب میں جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی صرف ایک ہی کشتی میں سواری کر سکتا ہے۔ دو کشتی میں سواری کرنا عملاً کسی کے لیے ممکن نہیں۔ دو کشتی کی سواری صرف خیالی طور پر ممکن ہو سکتی ہے۔ عملی طور پر دو کشتی کی سواری کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ آدمی بیک وقت دو قسم کے فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی دو طرفہ مزاج کی بنا پر وہ دو کشتی میں سواری کرنے کا خیالی منصوبہ بنا لیتا ہے۔ مگر آدمی کو جاننا چاہیے کہ دو کشتی کا سفر صرف خیالات کی دنیا میں ممکن ہے۔ ایسا سفر کبھی حقیقت کی دنیا میں ممکن نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ترجیح کا اصول اختیار کرے۔ وہ ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔ وہ ایک منزل تک پہنچنے کے لیے دوسری منزل کی طرف دوڑنا نہ چاہے۔ اس معاملہ میں آدمی کے پاس اس کے سوا کوئی اور انتخاب نہیں۔

آدھی کہانی

عام طور پر لوگوں کا یہ مزاج ہے کہ وہ اپنی کہانی کا نصف آخر حصہ بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کا ابتدائی نصف حصہ چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو کسی نے سڑک پر مار دیا تو اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وہ کہے گا کہ فلاں شخص نے مجھے سڑک پر مارا۔ مگر وہ یہ نہیں بتائے گا کہ خود میں نے کیا بات کی جس کی وجہ سے وہ مشتعل ہو گیا اور اشتعال کے تحت مجھ کو مار دیا۔

اسی طرح دو گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو اور ظلم و زیادتی کے واقعات پیش آئیں تو اس میں یقیناً کوئی ایک گروہ ہوتا ہے جو اپنے کسی فعل سے دوسرے گروہ کو بھڑکا دیتا ہے۔ اس طرح دوسرا گروہ بھڑک کر فساد کرنے لگتا ہے۔ مگر پہلا گروہ جب اس واقعہ کو بتائے گا تو وہ صرف واقعہ کے دوسرے حصے کو بیان کرے گا۔ وہ کہے گا کہ فلاں گروہ نے اس طرح ہمارے خلاف فساد کیا مگر وہ یہ نہیں بتائے گا کہ ہم نے خود فلاں فعل کیا جس کی وجہ سے دوسرا فریق غصہ ہو کر ہم سے انتقام لینے لگا۔ اس کو ایک لفظ میں ناقص رپورٹنگ کہہ سکتے ہیں۔

یہ ناقص رپورٹنگ ہمارے سماج میں عام ہے۔ ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ وہ اس طرح کے معاملہ میں اپنے حصہ کی بات کو چھپا لیتے ہیں اور صرف دوسرے کے حصہ کی بات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک غیر منصفانہ رپورٹنگ ہے۔ غیر منصفانہ رپورٹنگ کے بیک وقت دو نقصانات ہیں — ایک یہ کہ صحیح طرز فکر پیدا نہ ہونا، دوسرے یہ کہ مسئلہ کا کبھی حل نہ نکلنا۔

مزید یہ کہ اس قسم کی رپورٹنگ ذہنی بددیانتی کا ایک فعل ہے۔ وہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ اس قسم کی ناکافی رپورٹنگ اخلاقی اعتبار سے بھی غلط ہے اور مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے اعتبار سے بھی بے فائدہ۔

کسی معاملہ کی آدھی کہانی بیان کرنے والا اپنے دل میں خوش ہو سکتا ہے لیکن اس کے وجود سے باہر کی دنیا میں اس روش کا کوئی فائدہ نہیں۔

نشانِ منزل

ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے جب سڑک بنائی جاتی ہے تو اس میں جگہ جگہ نشانات لگائے جاتے ہیں۔ یہ نشانات مسافر کو بتاتے ہیں کہ وہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ یہ نشانات بتاتے ہیں کہ مسافر کے لیے صحیح سمت کیا ہے۔ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے وہ آخر کار اپنی مطلوب منزل تک پہنچ جائے۔ جو آدمی ان نشانات کی پیروی کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے گا۔ وہ یقیناً اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔

اسی طرح زندگی کے سفر کا بھی ایک راستہ ہے۔ اس راستہ میں بھی کچھ نشانات مقرر کر دیے گئے ہیں۔ جو آدمی چاہتا ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ راستہ کے نشانات کو پڑھے اور پوری طرح اس کی پیروی کرے۔

زندگی کے سفر کے یہ نشانات کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر اپنے لیے ایک راستہ کا انتخاب کرے، ایک ایسا راستہ جس کو پھر کبھی چھوڑنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ راستہ بدلنا گویا اپنے سفر کو پیچھے لے جانا ہے۔ وہ اپنے سفر کی مدت کو کم کرنا ہے۔ کامیابی ہر راستہ میں ممکن ہے مگر جو آدمی اپنا راستہ بدلتا ہے وہ کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے بعد دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ راستہ کی رکاوٹوں میں کبھی نہ الجھے۔ وہ ہر رکاوٹ سے اعراض کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جائے۔ رکاوٹوں سے ٹکرانا زندگی کے سفر کو روک دیتا ہے اور رکاوٹوں کو نظر انداز کرنا زندگی کے سفر کو مسلسل جاری رکھتا ہے۔

پھر مسافر کو چاہیے کہ وہ درمیان میں ملنے والے چھوٹے چھوٹے فائدوں پر قانع نہ ہو، وہ اپنے نشانہ سے کبھی نظر نہ ہٹائے۔ بڑی کامیابی پانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس دنیا میں بڑی کامیابی صرف اس انسان کا حصہ ہے جو چھوٹی کامیابی پر راضی نہ ہو۔ جو بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے فائدہ کو نظر انداز کر سکے۔ جو مستقبل کی امید میں حال سے اوپر اٹھ جائے۔

ہر آدمی کی یہ ضرورت ہے کہ زندگی کے سفر میں اس کے پاس ایک گائڈبک ہو۔ زندگی میں بار بار ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ آدمی کو ایک فیصلہ لینا ہوتا ہے۔ ان تمام مواقع کے لیے زیرنظر کتاب ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔
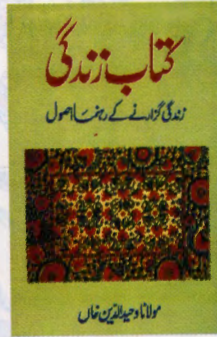
ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 81-7898-475-X

9 788178 984759
₹ 70